ماہ نامہ
قومی زبان
جولائی ۲۰۲۴ء کراچی

بانی: بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

جاری شدہ: ۱۹۴۸ء

مدیرِ منتظم

سید عابد رضوی

مدیر

ڈاکٹر یاسمین سلطانہ فاروقی

معاون

سیّد علی حسن

فی پرچہ: ۲۵۰ روپے

سالانہ (صرف رجسٹری سے): ۲۵۰۰ روپے

سالانہ (ہوائی ڈاک سے) ۵۰ پونڈ/۱۰۰ ڈالر

کتب و رسائل کی خریداری کے لیے منی آرڈر/بنک ڈرافٹ بنام انجمن ترقی اردو پاکستان ارسال کیجیے۔

انجمن ترقی اُردو پاکستان

شعبۂ تحقیق و تالیف و تصنیف

اُردو باغ، ایس ٹی۔۱۰، بلاک ۱، گلستان جوہر، کراچی

رابطہ: ۳۴۱۶۱۱۴۳-۰۲۱ شعبۂ فروخت: ۰۳۳۲-۲۷۹۰۸۴۳

atup.khi@gmail.com http://www.atup.org.pk

سید ایف ایچ عابد رضوی، مدیرِ منتظم نے انجمن ترقی اُردو پاکستان، اردو باغ، کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

فہرست

اداریہ	ڈاکٹر یاسمین سلطانہ فاروقی	۳
خلیق ابراہیم خلیق: شخصیت اور فکر و فن	مسلم شمیم	۵
پروفیسر نجیب علی کی یادنگاری	حافظ صفوان محمد	۱۲
سوشل میڈیا، ادیب اور ادب کا فروغ	ذوالفقار علی بخاری	۱۶
الف لیلہ و لیلہ: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	محمد عارف اقبال	۲۲
عابد رضا کے مجموعۂ کلام ''روزنِ سیاہ'' پر ایک نظر	نجمہ عالم	۴۱
اینٹی غزل کے دامن میں پلتی گنجائشیں	خان حسنین عاقبؔ	۴۵
اردو ناول میں اسلامی شعائر کی عکاسی	خورشید ربانی	۵۴
محمد حفیظ خان کے ناول ''انواسی'' کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ	محمد شاہد حفیظ	۷۸
اردو غزل کی تشکیلِ جدید میں (منتخب ہندوستانی شعرا کا حصہ	محسن خالد محسنؔ	۸۴
رفتارِ ادب　[گوہر تاج، فاکہہ قمر]		۹۹
بارے کچھ اپنا بیاں ہوجائے	سیّد عابد رضوی (مدیرِ منتظم)	۱۰۲

اداریہ

اردو زبان صدیوں پرانی ہے۔ برصغیر میں جنم لینے والی اس زبان نے گزرتے وقت کے ساتھ ترقی کی اور لسانی تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ شاعری ہو یا نثر مثلاً کہانیاں، ڈرامے، ناول، افسانے، داستانیں، نظمیں، غزلیں، حمد و نعت، منقبت اور مرثیے وغیرہ، ان تمام اصناف میں اپنے اپنے وقت کے لکھاریوں نے بڑا نام پیدا کیا اور نہ صرف اردو زبان کی خدمت کی بلکہ زبان و ادب کا خزانہ اگلی نسل تک پہنچانے میں اپنا حصہ ڈالا۔ ان تمام اصناف کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور ان کی وجہ سے اردو کا دامن وسیع ہوا۔ مگر اس کے ساتھ ایک بہت اہم شعبہ ترجمہ نگاری کا بھی ہے۔ ترجمہ نگاری ایک ایسی صنف ہے جس نے اردو ادب میں دوسری زبانوں کے شعرا، ادیب، فلسفیوں اور مفکروں کو روشناس کروایا۔ کسی دوسری زبان سے کیا جانے والا ترجمہ محض کتابوں میں اضافہ کرنے کا ذریعہ نہیں ہوتا بلکہ اس خطے، وہاں کی ثقافت، رہن سہن اور علوم و فنون کا بھی عکاس ہوتا ہے۔

غیر منقسم ہندوستان میں اول اول سرکاری فرمان عوام الناس تک پہنچانے کے لیے سرکاری زبان فارسی سے علاقائی زبان میں ترجمے کیے جاتے تھے پھر یہ سلسلہ علم و ادب تک پھیلا اور فارسی و عربی زبان کے ادب کے اردو زبان میں تراجم ہونے لگے۔ مغلیہ دور کے بعد برطانوی راج میں جب انگریزوں نے اردو سیکھانے کے لیے باقاعدہ ادارے قائم کیے تو اس وقت ترجمہ نگاری بھی ایک اہم صنف کے طور پر سامنے آئی۔ فورٹ ولیم کالج کا نام ترجمہ نگاری کے حوالے سے اہم ہے۔ شروع شروع میں اردو کے جتنے تراجم ہوئے، وہ فورٹ ولیم کالج میں ہی کیے گئے۔ اس کالج سے بڑے بڑے ادیب و دانشور منسلک تھے جو مترجم کا کام انجام دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دہلی کالج بھی ترجمے کے حوالے سے مشہور تھا وہاں انگریزوں کو اردو پڑھائی جاتی تھی اور اس مقصد کے لیے دوسری زبانوں کی کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے جاتے تھے۔ بعد میں جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن) کے تحت دارالترجمہ قائم کیا گیا جہاں باقاعدہ نصاب کی کتابوں کا ان کی اصطلاحات کے ساتھ ترجمہ کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں ہی ایک دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی بھی قائم کی گئی تھی جو جدید موضوعات پر کتابوں کے ترجمے کیا کرتی تھی۔ اس طرح ترجمہ نگاروں نے دیگر زبانوں کے ادب کو اردو کا حصہ بنایا اور دیگر ممالک کی تہذیب اور علم و ادب سمجھنے اور سیکھنے میں مدد فراہم کی۔ یہ وہ دور تھا جب ترجمہ نگاری دو طرح سے ہوا کرتی تھی ایک نثری دوسری منظوم ترجمہ نگاری۔ عہد حاضر کی بہ نسبت دوسرا طریقہ اٹھاریں و انیسویں صدی میں بہت مقبول رہا اہل علم و ادب آج بھی اس فن کو پسند کرتے ہیں۔ ایسے کئی فن پارے جواب نادر کتب و مخطوطات میں شمار کیے جاتے ہیں، کتب خانوں میں موجود ہیں۔ یہ منظوم ترجمے نہایت شان دار

ہوا کرتے تھے لیکن اب اس طرح کی منظوم ترجمہ نگاری نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے جس سے یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ شاید اب یہ فن معدوم ہوکر رہ جائے گا۔ جب کہ نثری تراجم کے معیار پر بھی سوالیہ نشان ہیں؟ نئی ٹیکنالوجی نے جہاں دیگر زبانوں میں ترجمے کو آسان بنادیا ہے وہیں معیار کے ناقص ہونے کے امکانات بھی بڑھ گئے ہیں۔ گوگل اس پر کئی سالوں سے مسلسل کام کررہا ہے مگر اب بھی بہت کام ہونا باقی ہے۔ مصنوعی ذہانت اور کمپیوٹر پہ دیگر ذرائع سے جب ترجمے کیے جاتے ہیں تو وہ متن کا حق اس طرح سے نہیں ادا کر پاتے جس طرح ایک زیرک اور تجربے کار مترجم معانی و مفاہیم اور سیاق وسباق کو پیشِ نظر رکھ کر کرتا ہے۔ مشینی ترجمے سے مضمون کی اصل روح مسخ ہو جاتی ہے، ایسے ترجمے قاری کو متن کی اصل لطافت اور معنیٰ سے دور کر دیتے۔ ترجمہ کرتے ہوئے متن کی اصل روح کو برقرار رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے قالب میں ڈھالنا ایک مشکل کام ہے۔ دیگر زبانوں سے اردو میں تراجم کی روایت کو برقرار رکھنے اور منظوم تراجم کی روایت کو پھر سے زندہ رکھنے کے لیے اہلِ ادب کو میدان میں آنا ہوگا۔ اس ضمن میں اردو ادب سے شغف رکھنے والے اساتذۂ کرام اور طلبا کے ساتھ اہلِ قلم حضرات کو بھی اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

(ی س ف)

مسلم شمیم ❁
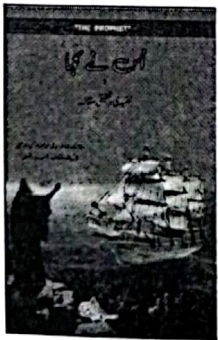
خلیق ابراہیم خلیق: شخصیت اور فکر و فن

چند شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا تصور شرفِ بشر کے تفاخر کو دوچند کر دیتا ہے، ان چند شخصیتوں کی میری فہرست بھی بہت مختصر ہے۔ ان میں ایک شخصیت جناب خلیق ابراہیم خلیق کی ہے۔ ایسی شخصیتوں کا تصور مرحوم سرور بارہ بنکوی کے مشہور شعر کی طرف توجہ مبذول کرادیتا ہے سو میرے ذہن میں جب بھی جناب خلیق ابراہیم خلیق کی شبیہ ابھری، سرور بارہ بنکوی کا یہ شعر لبوں پر بے ساختہ مچلنے لگتا ہے:

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے، وہ لوگ
آپ نے دیکھے نہ ہوں شاید مگر ایسے بھی ہیں (سُرور بارہ بنکوی)

خلیق ابراہیم خلیق کے حوالے سے یہ خوش گوار تاثر ان کے پورے حلقۂ ارادت کی قدرِ مشترک ہے۔ ان کی شخصیت کی جامعیت اور کثیر الجہتی پر تمام گوشوں سے روشنی ڈالنا اور گفتگو کرنا زیرِ نظر تحریر میں شامل نہیں ہے، بلکہ میرے پیشِ نظر وہ صاحبِ فکر و نظر شخصیت ہے جو کتاب ''منزلیں گرد کی مانند...'' کے مطالعے کے نتیجے میں مجھ پر منکشف ہوئی ہے اور جس نے مجھے بے حد متاثر کیا اور سچ پوچھیے تو اس کتاب کے مطالعے سے قبل میری عقیدت اور احترام کی نوعیت بے اساس تھی۔ اس کتاب کے علاوہ میں نے ان کی تین طویل نظموں کا مجموعہ 'اجالوں کے خواب' پڑھا تھا اور توجہ سے پڑھا تھا۔ اس مجموعے کے مطالعے کے دوران ان نظموں کے خالق کی وسعتِ نظر کے ساتھ تبحرِ علمی کا اندازہ ہوا تھا مگر اس کی نوعیت بھی abstraction پر مبنی تھی یعنی قیاس اور تخیل کی کارفرمائی تھی، مگر ''منزلیں گرد کی مانند...'' کے مطالعے نے مجھے ''آفتاب آمد دلیلِ آفتاب'' کے مرحلے میں پہنچا دیا اور اب وہ میرے سامنے ایک intellectual giant کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا world view اور global vision قابلِ رشک ہے اور جس کا آئیڈیالوجیکل کمٹمنٹ قابلِ تقلید۔

خلیق ابراہیم خلیق کے آبا و اجداد کا تعلق کشمیر سے ہے۔ وہ برہمن ذات کی معروف ترین شاخ کول سے تعلق رکھتے ہیں، یہی وہ شاخ ہے جس سے موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو کا تعلق تھا جو دہلی کی ایک نہر پر آباد ہونے کے حوالے سے 'نہرو' کہلائے۔ خلیق صاحب کا قبیلہ اسلام قبول کرنے کے بعد ترکِ وطن کر کے جھوائی ٹولہ لکھنؤ میں آباد ہو گیا، وہاں انھوں نے طبابت کا پیشہ اختیار کیا اور اطبائے جھوائی ٹولہ نے ہند گیر شہرت حاصل کی۔ جناب خلیق ابراہیم خلیق یکم فروری ۱۹۲۶ء کو لکھنؤ کے مذکورہ خانوادے میں پیدا ہوئے۔

❁ ۵۰۵، رفیق پلازہ نزد سعید منزل، ایم اے جناح روڈ، کراچی، فون: ۲۱۹۲۳۴۷ ۔ ۰۳۱۴

۱۹۲۶ء میں خلیق صاحب کے والد حکیم محمد رفیق ابراہیم حیدر آباد دکن میں مقیم تھے۔ وہ جلد ہی لکھنؤ واپس آ گئے جہاں خلیق صاحب نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ وہ مرزا محمد عسکری جیسے جید عالم کے زیرِ تربیت رہے۔ کالی چرن ہائی اسکول سے انھوں نے میٹرک پاس کیا، کرسچین کالج سے انٹرمیڈیٹ کیا، پنجاب یونی ورسٹی سے بی اے میں امتیازی کامیابی حاصل کی اور ادیب فاضل اردو میں یونی ورسٹی میں ٹاپ کیا۔ اس دوران ان کا تخلیقی سفر شروع ہوا اور ان کی ادبی تحریریں، افسانے، مضامین و مقالات اور شعری تخلیقات ہندوستان کے موقر ترین جریدوں میں شائع ہونا شروع ہوگئیں۔ وہ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور انجمنِ ترقی پسند مصنفین میں بھی فعال رہے اور کچھ عرصے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ شعر و ادب سے گہرے شغف کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی معاشی زندگی کے لیے فلمی کیریئر کا انتخاب کیا جس کا آغاز انفارمیشن فلمز آف انڈیا سے بحیثیت ڈاکومنٹری رائٹر کیا اور وہیں فلم سازی کی تربیت حاصل کی۔ ۱۹۵۳ء میں پاکستان آنے کے بعد کچھ عرصے انگریزی روزناموں 'ٹائمز آف کراچی'، 'پاکستان ٹائمز' لاہور اور 'ڈان' کراچی میں فری لانس صحافی کی حیثیت سے مضامین اور کالم لکھتے رہے، پھر محکمۂ فلم و مطبوعاتِ حکومتِ پاکستان سے منسلک ہوگئے جہاں سے انھوں نے ریٹائرمنٹ حاصل کی۔ انھوں نے انتہائی کم وسائل اور نامساعد حالات میں اعلیٰ معیار کی درجنوں دستاویزی فلمیں بنائیں جن میں کئی ایک نے بین الاقوامی اعزازات حاصل کیے، ان میں Cannes سے ملنے والا ریوارڈ بھی شامل ہے۔ ۱۹۶۹ء میں انھیں سینماٹوگرافی کے شعبے میں خدمات کے اعتراف میں تمغۂ امتیاز دیا گیا۔ ان کی کامیاب ترین دستاویزی فلموں میں 'پاتھ وے ٹو پراسپیریٹی'، 'وَن ایکڑ آف لینڈ'، 'کلچرل ہیریٹیج آف پاکستان'، 'پاکستان اسٹوری'، 'فنِ تعمیر' اور 'مرزا غالب' شامل ہیں۔

مذکورۂ بالا کوائف سے جناب خلیق کی شخصیت کی کثیر الجہتی اور جامعیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ انھوں نے تینوں شعبوں یعنی صحافت، فلم سازی اور ادب میں اپنے کارناموں کے ایسے تابندہ نقوش چھوڑے ہیں کہ جن کے توسط سے وہ تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ ایک اہم حوالے کے طور پر جانے جائیں گے۔ بہرحال ''اجالوں کے خواب'' کی تین نظموں اور غزلوں میں شاعری کے جو محاسن اور غیر معمولی توانائی پائی جاتی ہے، میری یہ رائے ہے کہ وہ بھرپور خلاقیت کے حامل تخلیق کار ہیں اور ان کی شاعری خاص خانوں میں رکھ کر دیکھی اور پرکھی جانے کے لائق ہے۔ ان کی اہم ترین تصنیف 'منزلیں گرد کی مانند....' جوان کو زندۂ جاوید بنانے کی ضامن ہے، میرا موضوعِ گفتگو ہے اسی حوالے سے۔

جناب خلیق ابراہیم کی شاعرانہ خلاقیت جوان کی غزلوں اور نظموں میں مجھے نظر آئی، اس کا ذکر ہو چکا ہے، اب میں اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں، یعنی ''منزلیں گرد کی مانند...'' کے مطالعے نے مجھے کیا کچھ دیا اور کیا کچھ دِکھایا، یعنی اپنا حاصلِ مطالعہ آپ تک پہنچانے کی نیت رکھتا ہوں۔ یہ کتاب جسے خودنوشت (autobiography) کا نام دیا گیا ہے، میرے نزدیک اس کی کئی حیثیتیں ہیں۔ خودنوشت کے علاوہ یادداشتوں (memoirs) کے خانے میں یہ کتاب اس طرح سجائی جاسکتی ہے جس طرح بطورِ خودنوشت لیکن اس کے علاوہ بھی اس کتاب میں کئی کتابیں پائی جاتی ہیں، بالفاظِ دیگر اس کے متن اور بطن سے کئی اور کتابوں کی ترتیب و تدوین کی جاسکتی ہے، ایک تاریخ بھی مرتب کی جاسکتی ہے جس میں برِصغیر کے ساتھ ساتھ ہم عصر عہد کی سیاسی تحریکیں مرقوم ہیں اور سماجی

اورثقافتی زندگی کا اجمالی بیان اور تجزیاتی documentation کیا گیا ہے۔ گزشتہ دو صدیوں پر محیط روشن خیالی، خرد افروزی اور تعقل پسندی کی معتبر روداد اس کتاب سے ماخوذ ہوسکتی ہے۔ تاریخ شعر و ادب کی بھی یہ ایک جامع کتاب ہے اور معروف معنوں میں ایک جامع تذکرے کی کتاب بھی اس میں شامل ہے اور یہ ایک ایسا تذکرۂ شعرا و ادبا ہے جس میں صاحبِ تصنیف کی بصیرت و بصارت کی روشنی قاری کی آنکھوں کو چکا چوند کیے رکھتی ہے اور ان کے تنقیدی شعور کا ایک ایسا اظہار ملتا ہے کہ اس کا مطالعہ اردو تنقید کی ایک بہت اہم کتاب کے طور بھی کیا جاسکتا ہے، یعنی یہ ایک ایسی تصنیف ہے جس کو کتاب الکتب کہا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کے مختلف شعبے اور گوشے اپنی جامعیت اور افادیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے فزوں تر اور وقیع تر ہیں۔ سوشل سائنسز کے طلبا کے لیے بھی اس کتاب میں اس قدر پُرکشش مواد شامل ہے جس طرح شعر و ادب کے طالبان کے لیے۔

صاحبِ کتاب نے اس تصنیف کو خودنوشت سوانح عمری قرار دیا ہے، لہٰذا ان کے اس اعلان بالجہر سے انحراف کرنے کی روش کیوں اپنائی جائے۔ اس کتاب کی قدر و قیمت، خصوصیات اور کثیر الجہتی اس دائرے میں رہ کر دیکھی جاسکتی ہے۔ بطور خودنوشت کے اس کا مقام متعین کرتے ہوئے ہمارے پیشِ نظر شاملِ کتاب جناب مشفق خواجہ کی وقیع رائے ہے۔ اس سے ایک اقتباس نذرِ قارئین کر رہا ہوں جس کی روشنی میں گفتگو آگے بڑھانے میں مدد ملے گی:

> عام طور پر خودنوشت نگار اپنی ذات پر پردے ڈالتے ہیں تاکہ حقیقت اس صورت میں سامنے آئے جس طرح وہ چاہتے ہیں، نہ کہ اس صورت میں جس طرح کہ وہ ہے۔ اپنی ذات کو کائنات کا مرکز سمجھ کر خود پرستی کی انتہاؤں تک پہنچ جاتے ہیں اور افسانہ و افسوں کو حقیقت بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس طرح آپ بیتی گزارے ہوئے واقعات کی نہیں، خواہشوں، تمناؤں اور مسرتوں کی روداد بن جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کی وجہ یہ ہے کہ خودنوشت نگار اس خود فریبی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ جس موضوع پر لکھ رہے ہیں، اُس کا ماخذ چوں کہ اُن کی اپنی ذات ہے، اس لیے اُنھیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ جو چاہیں اور جس طرح چاہیں لکھیں، لیکن ایک ذمے دار خودنوشت نگار اس ناجائز حق کو استعمال نہیں کرتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ آپ بیتی آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر نہیں لکھی جاتی کہ صرف اپنا ہی چہرہ نظر آئے، اپنے گرد و پیش پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ جس معاشرے سے وہ وابستہ ہے، اُسے نظر انداز کر کے اور اپنے آپ سے انصاف نہیں کرسکتا۔ پوری شخصیت آئینے میں نہیں، معاشرے کے چوکھٹے میں اجاگر ہوتی ہے۔ ایک اچھی آپ بیتی صرف ذات کی ترجمان نہیں ہوتی، اُس معاشرے کی بھی عکاس ہوتی ہے جو فرد کی ذات کی تشکیل و تعمیر کرتا ہے اس اعتبار سے خلیق ابراہیم خلیق کی زیرِ نظر آپ بیتی ایک مثالی آپ بیتی ہے۔ یہ ایک فرد کی داستانِ حیات ہی نہیں، ایک پورے عہد کی معاشرتی، سیاسی علمی اور ادبی تاریخ بھی ہے۔

جناب مشفق خواجہ کی مذکورہ رائے کا آخری فقرہ میرے نزدیک خصوصی طور پر قابلِ توجہ اور قابلِ غور ہے۔ میں نے جب

''منزلیں گرد کی مانند...'' کا مطالعہ کیا تو مجھے مذکورہ رائے کے حرف حرف سے متفق ہونے کا احساس ہوا اور میری یہ تحریر گویا اس احساس کی تفسیر ہے۔ اس خودنوشت کے مطالعے کے دوران متعدد خودنوشت سوانح عمریوں کے نقوش ذہن کے پردے پر نمودار ہوئے۔ خودنوشت سوانح عمریوں کا مطالعہ میرے خیال میں ادب اور غیر ادب کے قارئین کے لیے یکساں دلچسپی کا سامان بہم کرتا ہے۔ 'ذکرِ میر' اور 'یادوں کی بارات' دو بڑے خلاقانِ ادب کی آپ بیتیاں ہیں۔ ''ذکرِ میر'' میں بھی اسی عہد یعنی زوال آمادہ جاگیردارانہ ثقافت و اقدار کی تصویر کشی ملتی ہے اور خانقاہی زندگی میں عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کے مدارج اور مراحل کی حکایات قارئین کو طرح طرح کے سوالات اور الجھنوں سے دوچار کرتے ہیں اور مجموعی طور پر اجالوں سے محروم سماج کی تصویر ابھرتی ہے۔ ''یادوں کی بارات'' میں انشا پردازی بلکہ انشائیہ نگاری کے سحر میں قاری جہاں مبتلا رہتا ہے وہاں سچ اور جھوٹ کی سرحدیں کہاں شروع ہوتی ہیں اور کہاں ختم ہوتی ہیں، ان وسوسوں اور مرحلوں سے بھی دوچار رہتا ہے۔ بہرحال ''ذکرِ میر'' اور ''یادوں کی برات'' کی ادبی حیثیت اور قدر و قیمت کا تعین کرنا میرا منصب نہیں۔ میر تقی میر اور جوش ملیح آبادی جیسی قد آور اور نابغۂ اعظم شخصیات کی خودنوشت کی جو شہرت اور مقبولیت تاریخ کا حصہ بن چکی ہے، وہ ''منزلیں گرد کی مانند...'' کے حصے میں کبھی نہیں آ سکتی۔ شہرت اور مقبولیت کے باب میں نہ سہی، افادیت اور اہمیت کے باب میں یہ خودنوشت ایک منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور اس اعتبار اور زاویۂ نظر سے تاریخِ ادب میں غیر معمولی خودنوشت گردانی جائے گی، اس کا وصفِ خاص آپ بیتی ''برائے نام'' اور جگ بیتی ''تمام'' ہونا ہے۔ خلیق صاحب نے سماج، عہد اور ہم عصر زندگی کو پہلے پیشِ نظر رکھا ہے اور اپنی ذات کو اس کا ایک ادنیٰ حصہ جانا ہے۔ سو یہ خودنوشت صاحبِ کتاب کے اس ادراک اور تفہیم کا بیان ہے جو اس نے اپنے سماج، اس کے ارتقائی مراحل، اپنے عہد اور ہم عصر زندگی کے حوالے سے حاصل کیا ہے اور غرض و غایت یہ نظر آتی ہے کہ وہ اس ادراک اور تفہیم کو بانٹنا اور اپنے قارئین سے share کرنا چاہتا ہے۔ یہ ورثۂ ادراک و تفہیم جو ایک ایسی بھرپور زندگی گزارنے کے بعد حاصل ہوتا ہے جیسی زندگی خلیق ابراہیم خلیق نے گزاری ہے۔ جناب خلیق ابراہیم خلیق کا دیرینہ تعلق اور ان کا تفخر ترقی پسند تحریک رہی ہے۔ یہاں یہ بات بھی برمحل ہے کہ خلیق صاحب نے صرف برِصغیر کی تحریکوں اور تبدیلیوں کا مشاہدہ نہیں کیا تھا بلکہ ان کے مشاہدے کا تناظر بین الاقوامی بلکہ عالمی (Global) ہے، چناں چہ انھوں نے کرۂ ارض پر ہونے والے حادثات و واقعات اور تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا تھا جسے زیرِ نظر کتاب میں تفصیل سے بیان بھی کیا ہے۔ انھوں نے 'انقلابِ روس کے اثرات اور اشتراکیت کا نفوذ' کے زیرِ عنوان جن افکار و خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ ان کے global vision کا اظہار ہے۔ دوسری عالمی جنگ ۱۹۳۹ء۔۱۹۴۵ء کا پس منظر اور پیش منظر بھی ان کے مشاہدے اور مطالعے کا حصہ رہا تھا جس کا بیان انھوں نے کتابِ مذکور کے گیارھویں باب میں کیا ہے۔ برِصغیر کی آزادی کی تحریک بھی وسیع تر تناظر میں دیکھی اور بیان کی گئی ہے، خصوصیت کے ساتھ انقلابِ اکتوبر کے آدرش کو پیشِ نظر رکھ کر آزادی کی تحریک کے حوالے سے یہ سوالات اٹھائے جانے لگے کہ آزادی کا مطلب و مقصد کیا صرف یہی ہے کہ گورے آقاؤں کی جگہ کالے آقا لے لیں، بلکہ آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ایسا نظام رائج کیا جائے جس میں عوام کی بالادستی ہو اور معاشرہ ہر قسم کے استحصال سے پاک ہو۔ یہ فکر ۱۹۱۷ء کے اشتراکی انقلاب کی دین تھی۔ یہ انقلاب روس کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں طلوعِ سحر کی حیثیت رکھتا تھا اور ساری دنیا کے مظلوم و محکوم محنت کش عوام کے لیے بیداری کا پیغام تھا جس نے دنیا بھر کے انسانیت

دوست دانش وروں کو شدت سے متاثر کیا جس کی پذیرائی علامہ اقبال نے اس شعر کی صورت میں کی تھی:

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں! ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک؟

برِصغیر کی تحریکِ آزادی کا پس منظر زیرِ نظر کتاب کے مختلف ابواب میں بیان ہوا ہے۔ ایک مختصر تاریخ تحریکِ آزادی اس کے اوراق اور بین السطور سے مرتب کی جاسکتی تھی جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے شروع ہو کر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قیامِ پاکستان تک پہنچ کر اپنی منزل اور سمت دونوں کھو بیٹھی۔ آزادی کی منزل Myth of Independence بن گئی اور ۱۹۷۱ء میں یہ خواب مزید منتشر ہوگیا جب ملک شکست و ریخت سے دوچار ہوا اور اس سانحے میں لاکھوں عوام کام آگئے۔ آزادی کی تحریک کی داستان میں تمام دھارے اور واقعات و سانحات کا بیان کہیں اختصار، کہیں تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں قارئین کے ذوقِ مطالعہ کو مہمیز کرتا ہے لیکن کہیں اس بیان میں Element of fiction اور Right of imagination کا عمل دخل نہیں پایا جاتا جو بات بھی کہی گئی ہے، وہ ٹھوس حقائق سے ماخوذ ہے۔ صاحبِ کتاب کا نقطۂ نظر اور زاویۂ نگاہ البتہ ہر مقام پر واضح ہے۔ اس باب میں خصوصیت کے ساتھ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس کا قیام ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ، پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء، میثاقِ لکھنؤ، خلافت تحریک ۱۹۲۸ء کا سائمن کمیشن اور نہرو رپورٹ، ۱۹۳۵ء کا گورنمنٹ ایکٹ آف انڈیا، دوسری جنگِ عظیم ۱۹۳۹ء-۱۹۴۵ء، کرپس مشن پلان ۱۹۴۲ء، کیبنٹ مشن پلان، ۱۹۴۲ء-۱۹۴۶ء کی Quit India Movement اور اعلانِ آزادی سے قبل ۱۹۴۶ء کے انتخابات اور بہت سی تحریکوں اور تنظیموں کا اس کتاب میں بھرپور ابلاغ کے ساتھ بیان ملتا ہے۔ صاحبِ کتاب کا سیاسی شعور اور سیاسی بصیرت بہرگام قارئین کی توجہ کا مرکز رہتی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ یہ مجموعۂ کتب ہے اور اس کے مختلف ابواب کو ترتیب دے کر متعدد کتابیں نذرِ قارئین کی جاسکتی ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے حوالے سے یہ کتاب میری رائے میں 'روشنائی' کے بعد سب سے اہم اور جامع کتاب ہے۔ ترقی پسند تحریک کے آغازِ سفر سے لے کر انجمنِ ترقی پسند مصنّفین کی پانچویں کانفرنس تک جو بمبئی کے نواح میں بھیمری میں ۲۷ مئی ۱۹۴۹ء کو منعقد ہوئی تھی اور جو تین روز جاری رہی تھی، اس کی ایک ایسی روداد شاملِ کتاب ہے جس میں نظریاتی مسائل سے لے کر تنظیمی امور پر تمام تر بحث و تمحیص کا تفصیلی بیان قارئین کے لیے فکر و شعور کے دریچے وا کرتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے ارتقائی سفر کی تفصیلات کتاب کے متعدد ابواب میں بیان کی گئی ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت سجاد ظہیر کی شہرۂ آفاق کتاب 'روشنائی' کی یاد تازہ ہوتی رہی ہے۔ سجاد ظہیر کی طرح خلیق صاحب کے یہاں فکری توازن و ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور انھوں نے تفصیل کے ساتھ بعض ترقی پسندوں کے فکری انتشار اور بعض کی انتہا پسندی کی نشان دہی کی ہے۔ خلیق صاحب نے کچھ مقامات پر ''روشنائی'' میں دی گئی۔ سجاد ظہیر کی آرا سے بھی اختلاف کیا ہے اور دلیل کے ساتھ اپنے موقف کا اظہار کیا ہے۔ پروفیسر احمد علی کے سلسلے میں ''روشنائی'' میں اظہار کیا ہے، خلیق سے اختلاف کیا ہے اور پروفیسر احمد علی کی ترقی پسند فکر اور نظریے سے کسی روگردانی کو انھوں نے قبول نہیں کیا۔ پروفیسر احمد علی نے بقول ان کے جو زمانہ لکھنؤ میں پہلے طالب علم اور پھر استاد کی حیثیت سے گزارا، وہ ترقی پسند ادب کی نشوونما اور فروغ کے لیے سجاد ظہیر، محمود

الظفر اور رشید جہاں کی معیت میں ان کی مساعی اور اردو میں ان کی تخلیقی سرگرمیوں کا سنہرا دور تھا۔ ۱۹۳۹ء میں پروفیسر احمد علی کی ادبی زندگی میں ایک اہم موڑ آیا۔ وہ انجمنِ ترقی پسند مصنفین سے الگ ہوگئے، مگر تنظیمی طور پر دور ہونے سے ترقی پسند فکر اور نظریے سے ان کی قربت برقرار رہی۔ سجاد ظہیر سے پروفیسر احمد کے اختلافِ رائے کو خلیق صاحب نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

> سجاد ظہیر صرف پرولتاری ادب یعنی اس ادب کو جو مزدوروں اور کسانوں کی زندگی اور ان کے مسائل کے بارے میں ہو ترقی پسند ادب قرار دیتے تھے، جبکہ احمد علی کا موقف یہ تھا کہ ادب کو کمیونزم کی تنگنائے میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی کے ہر پہلو میں ترقی پسندی موجود ہے اور متوسط طبقے کی زندگی کے بارے میں بھی جس سے تحریک کے بانی ارکان کا تعلق تھا، ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے لکھا جاسکتا ہے ذرا غائر نظر سے دیکھیے تو احمد علی کا یہ بیان تسامحات پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ سجاد ظہیر اور محمود الظفر کی طرح کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں تھے لیکن اشتراکیت کی جانب ان کا رویہ ہمدردانہ تھا اور انسانیت کو درپیش بیشتر مسائل پر ان کی سوچ وہی تھی جو ان کے کمیونسٹ دوستوں کی تھی۔ ادب وفن کے بارے میں مارکس اینگلز اور لینن کے خیالات اور رویوں میں جو وسعتِ نظر کار فرما تھی، وہ اس سے بخوبی واقف تھے۔

کچھ آگے چل کر خلیق صاحب نے لکھا ہے:

> انجمن کے بعض نوجوان اراکین کے علی الرغم سجاد ظہیر نے احمد علی کے ادبی ہنر اور ذوق کا اعتراف تو کیا لیکن ان کے اردو کو چھوڑ کر انگریزی میں لکھنا شروع کردینے پر جس رائے کا اظہار کیا ہے، اس کی اُن جیسے انصاف پسند دانش ور سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ احمد علی اپنی انگریزی تحریروں میں بھی انسان دوستی حقیقت نگاری اور ترقی پسندی کی روش پر قائم رہے اور ان کی کتابیں ٹیکساس یونی ورسٹی اور کولمبیا یونی ورسٹی کے نصاب میں شامل رہی ہیں۔ اس کے علاوہ کم لکھنے کے باوجود وہ اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں میں شامل ہیں۔

سجاد ظہیر اور احمد علی کے درمیان پائے جانے والے اختلافِ رائے کے بارے میں خلیق صاحب کا موقف یہ ہے:

> بہرکیف اس افسوس ناک قضیے میں مغالطوں اور غلط فہمیوں کا بھی دخل تھا اور دونوں فریق غلط اندیشی کے بھی مرتکب تھے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ تمام بدگمانیوں اور خرخشوں کے باوجود احمد علی تمام عمر ترقی پسند رہے اور اپنی ترقی پسندی پر انھیں ہمیشہ فخر رہا۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے حوالے سے بھی خلیق صاحب کا رویہ اور رائے دوسروں ترقی پسند اکابر بشمول سجاد ظہیر کے مختلف ہے جس کا اظہار زیرِ نظر کتاب میں بھی ہے اور ان کے اس مضمون میں بھی جو ۲۶ اگست ۱۹۹۲ء کو آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی میں انجمنِ ترقی پسند مصنفین کے اجلاس بیادِ اختر حسین رائے پوری میں انھوں نے پڑھا تھا۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے حوالے سے

مذکورہ مضمون کے آخری جملے ناقابلِ فراموش ہیں:

> ارتقائے انسانی کے سفر کے موجودہ مرحلے میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی دانش ورانہ بصیرت کا یہ اظہار اکیسویں صدی کی دہلیز پر ترقی پسند ادیبوں اور سماجی سائنس دانوں کے لیے نشانِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ عصرِ حاضر کی شکست و ریخت میں انسان کی تعمیر کے دوستون باقی ہیں، جمہوریت اور اشتراکیت۔ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور تشنہ ہے۔ جمہوریت وہ جو سرمایہ داری کے تسلط سے آزاد ہو اور اشتراکیت وہ جس پر کسی بھی قسم کی آمریت کا غلبہ نہ ہو۔

''منزلیں گرد کی مانند...'' کو اگر ایک تذکرۃ الشعرا و ادبا کہا جائے تو بھی غلط نہ ہوگا، مگر یہ ایسا تذکرہ ہے جس میں شعرا و ادبا کی ذات وصفات اور ان کے فن وشخصیت کا ایسا جائزہ اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے جو تنقیدی مقالات میں پایا جاتا ہے۔ شعرا کی ایک طویل فہرست ہے جن کے فن اور شخصیت پر کہیں اختصار، کہیں تفصیل سے انھوں نے بحث کی ہے اور ان کے مقام ومنصب کا تعین کیا ہے۔ شعرا کے فن اور کمالِ فن پر ناقدانہ اظہار کرنے میں دیانتِ فکر ونظر کے ساتھ وسعتِ قلب ونگاہ سے کام لیتے ہوئے انھوں نے کسی امتیا زوتفریق کو خاطر میں نہیں رکھا۔ تمام مکاتبِ فکر کے شعرا پر انھوں نے ایک دیانت دار ناقد کی نظر سے بھر پور انصاف سے کام لیا ہے۔ ان شعرا میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند شعرا سب بھی شامل ہیں۔

اس کتاب میں مجاز لکھنوی پر باضابطہ ایک طویل مقالہ ہے جو میری رائے میں مجاز کے حوالے سے لکھا جانے والا بہترین مقالہ ہے بلکہ اسے ایک مکمل کتاب کا درجہ حاصل ہے۔ میں نے خلیق صاحب سے یہ گزارش کی ہے کہ مجاز پر شاملِ کتاب تحریر کچھ اور اضافے یعنی انتخابِ کلام کے ساتھ جداگانہ کتاب کی صورت میں شائع ہو تو اس کی افادیت اور اہمیت دو چند ہو جائے گی۔ اس کتاب میں یگانہ چنگیزی کے حوالے سے بھی جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ اپنی انفرادیت کا حامل ہے مجھے ایک غیر معروف شاعر شمس عظیم آبادی پر ان کی مفصل تحریر بڑی غیر معمولی لگی۔ شمس عظیم آبادی کو میں نے اپنے لڑکپن میں دیکھا اور سنا تھا جب وہ کچھ دنوں کے لیے بمبئی سے عظیم آباد (پٹنہ) آئے تھے، اس دوران کے قیام کا احوال بھی خلیق صاحب کی تحریر کا حصہ ہے۔

''منزلیں گرد کی مانند...'' کے ابتدائی صفحات میں 'عرضِ حال' کے زیرِ عنوان خلیق نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے، ''یہ آپ بیتی سے زیادہ ایک تہذیب کی سرگزشت ہے''۔ یہ جملہ اس کتاب کے مندرجات اور موضوعات کا بھر پور عکاس ہے۔ تہذیب کی یہ سرگزشت لکھنؤ کی جاگیردارانہ ثقافت کی باقیات سمیت اس کے زوال کی حکایتِ خوں چکاں بھی ہے اور بمبئی میں ابھرتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام میں پیدا ہونے والے سماج اور اس نظام کے اپنے مخصوص تقاضوں اور ترجیحات کا بیان بھی جو صاحبِ تصنیف کی بصیرت وبصارت کا غماز ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع اور افادیت کے اعتبار سے ایک نایابِ روزگار دستاویز ہے اور اس کی ادبی قدر و قیمت غیر معمولی بھی ہے اور لازوال بھی۔ ''منزلیں گرد کی مانند...'' زندۂ جاوید رہنے والی کتابوں میں شامل ہو چکی ہے اور خود اس کتاب کے حوالے سے خلیق ابراہیم خلیق زندۂ جاوید ہو گئے ہیں۔

❀❀❀

حافظ صفوان محمد ٭

پروفیسر نجیب علی کی یادنگاری

نجیب صاحب کو میں تیس چالیس سال سے جانتا ہوں۔ وہ میری مادرِ علمی گورنمنٹ ایس ای کالج بہاول پور کے اُن اساتذہ میں سے ہیں جن سے میں نے کوئی باقاعدہ کلاس نہیں پڑھی لیکن وہ ہمیشہ قریب رہے۔ وجہ میرے ابا جان پروفیسر عابد صدیق صاحب سے دوستی اور پھر باجی نزہت جبین کا میاں ہونا۔ اُن سے تعلق کی باقی سب حیثیتیں ثانوی درجوں کی ہیں۔

ایک پڑھا لکھا پروفیسر جو میرے ابا جان کا دوست ہو اُس کا ادب سے دور رہنا ممکن نہیں۔ نجیب صاحب نے کل دوپہر مجھے اپنے مضامین کا مجموعہ ''یادیں: کچھ اپنی کچھ اوروں کی'' یہ کہتے ہوئے دیا کہ اِسے دیکھ لینا اور اِس کی اشاعت کا کوئی سلسلہ بنانا۔ ادب کو اچھا سمجھنے والے باذوق لوگ بہاول پور میں بہت سے ہیں لیکن وہ لوگ جو باقاعدہ قلم کے ساتھ دوستی کا تعلق بنالیں اُن کی تعداد ذرا کم ہی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں اِن مضامین کے مطالعے سے فارغ ہوا تو سوچا کہ جو maiden though یا FIR یعنی First Impression Report ابھی میرے ذہن کے پردے پر موجود ہے اُسے اہلِ علم کے حضور برائے ملاحظہ پیش کردوں۔

عطاء الحق قاسمی نے لکھا ہے کہ بڑے آدمی کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ ہر جملے کا آغاز انگریزی میں کرتا ہے اور لہجے کو حسبِ توفیق ''آکسن'' بنانے کی کوشش کرتا ہے، تاہم واضح رہے کہ انگریزی زبان کے قواعد وضوابط سے بڑے آدمی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ نجیب صاحب نہایت اچھی آکسن لہجے والی انگریزی بولتے ہیں اگرچہ اُنھیں بڑا آدمی ہونے کا کوئی عارضہ لاحق نہیں ہے۔ اب سے پہلے میں یہی سمجھتا تھا کہ وہ لکھتے بھی صرف انگریزی میں ہوں گے کیوں کہ بہت عرصہ پہلے صادق پبلک سکول بہاول پور کے آرگن ''صادق'' کے کسی شمارے میں اُن کی ایک انگریزی تحریر کا نظر سے گزرنا یاد پڑتا ہے۔ ''پاکستان ٹائمز'' اور ڈان کے نامہ نگار مجید گِل صاحب کے جاری کردہ ہفتہ وار Bahawal Fax میں بھی اُن کے انگریزی مضامین نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب اور اُن کے اردو مضامین کو دیکھ کر مجھے دوہری خوشی ہوئی ہے کیوں کہ نجیب صاحب اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں یکساں مہارت اور بے ساختگی سے لکھتے ہیں۔

یہ مضامین شکار کے شوقین ایک نوجوان کے بچپن، لڑکپن اور پھر بھرپور عملی زندگی گزارنے والے ایک ایسے پروفیسر سے ''سرزد'' ہوئے ہیں جسے ادب میں کوئی سنگِ میل عبور کرنے کا دعویٰ یا نام پیدا کرنے کا شوق نہیں ہے۔ بیشتر مضامین اُس پر خود بیتے واقعات ہیں تاہم دوسروں کے سنائے بعض واقعات بھی معرضِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔ اِن تمام واقعات میں کوئی دیومالا یا فکشن نہیں ہے بلکہ

٭ مینجر پی ٹی سی ایل ٹرانسپورٹ نیٹ ورک، سینٹرل ٹیلی فون ایکسچینج، بہاول پور۔ فون: ۰۳۳۳-۵۲۴۶۰۹۴

یہ سبھی حقیقی زندگی کے مشاہدات ہیں۔ حقیقی زندگی کے واقعات کو لکھنے میں جو سماجی، خاندانی اور معاشی مشکلات ہوتی ہیں اور ایسے واقعات کے ساتھ منسلک جو لازمی سول اور فوجی انتظامیہ کے خدشات ہوتے ہیں، نجیب صاحب اُن سب سے گزرے ہیں اور گزر رہے ہیں۔ اِن مضامین میں پایا جانے والا زمانہ تاجِ برطانیہ کے دور میں ۱۹۲۲ء میں شروع ہونے والے ستلج ویلی پراجیکٹ سے ذرا پہلے سے لے کر آج تک یعنی پوری ایک صدی پر محیط ہے، اور یہ صدی بہاول پور کی ایک صدی ہے۔ شکاریات میں سے پرندوں کے شکار، کبوتروں، زمینات، دریا اور موسموں سے متعلق اصطلاحات اور مقامی الفاظ کی ایک معتد بہ مقدار اِس متن میں موجود ہے۔ مذہب اور شعائرِ مذہب کے احترام کی ایک مضبوط زیریں لہر بھی اِن سب مضامین میں موجود ہے۔

یہ مضامین مختلف لوگوں کے خاکے ہیں اور اِن میں نجیب صاحب برابر موجود ہیں، لیکن پھر بھی یہ تمام مضامین مل کر اُن کی اپنی آپ بیتی نہیں بناتے۔ خاکے کی یہ بنیادی مطلوب خوبی ہے کہ اُس میں ممدوح ہی کی تصویر کشی غالب ہو نہ کہ مصنف خود کو غالب کردار کے طور پر پیش کرے۔ فنِ خاکہ نگاری کا یہ بنیادی وصف نجیب صاحب کو فطرت نے ودیعت کیا ہے جسے اُنھوں نے انتہائی دیانت داری سے برتا ہے۔

گو اِن مضامین میں لکھے تمام واقعات اور تفصیلات حقیقی زندگی سے متعلق ہیں لیکن نجیب صاحب کا اسلوب فطری طور پر ایسا ہے جیسے وہ افسانہ سنا رہے ہوں۔ ادبی اصطلاح میں اِس اسلوب کو جادو بیانی کہا جاسکتا ہے۔ روزمرہ زندگی کے بیشتر واقعات جیسے زن زر زمین پر ہونے والے قتل اور جائیداد کی چھین جھپٹ، تقسیمِ ہند کے خونچکاں مناظر، صنفِ مخالف کے لیے دل میں امنڈنے والی لہریں، جوانی کا زور، کچے کے علاقے کے ڈاکوؤں سے ملاقات، شوہر کی غیرت اور بیوی کی آبرو کی حفاظت، ٹرانس جینڈروں کے مسائل اور اِن میں سے شریفانہ زندگی گزارنے کا عزم کرنے والے لوگ، زیادتی اور اجتماعی زیادتی کا شکار عورتیں، تیزاب گردی، عورتیں اٹھانے اور اُنھیں بیچنے والے زمیندار، لنچنگ اور ماب کلنگ، سماج میں مذہبی منافرت اور تکفیر کے کلچر کی اشاعت بشمول سرتن سے جدا والی لہر کے مسموم اثرات، تعلیم حاصل کرنے کے فوائد اور تعلیم سے بھاگ جانے والوں کے برے حالات، مذہب تبدیل کر کے مسلمان ہونے والی ہندو خواتین، تدین اور متدینین، وغیرہ، بہت سا سامان یہاں موجود ہے لیکن اِن مشاہدات کو معرضِ تحریر میں لاتے ہوئے جو فسوں باندھا گیا ہے وہ لاجواب ہے۔ حد یہ ہے کہ اِس متن میں ایک کھیوٹ کو مزدوری میں برطانیہ کی کرنسی (پاؤنڈ سٹرلنگ) دینے والے گورے بھی مل جاتے ہیں۔ یوں یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ تقسیم سے قبل بہاول پور جیسی خوش حال ریاست میں بہاول پور کی ریاستی کرنسی اور تاجِ برطانیہ کی ہندوستانی کرنسی کے ساتھ ساتھ فارن ایکسچینج بھی عام چلتا تھا۔

اِن مضامین سے یہ معلومات بھی ملتی ہے کہ ''کچے کا علاقہ'' کیا ہے اور کچے کے علاقے کے ڈاکو کون ہیں اور کیسے وجود میں آئے۔ نجیب صاحب کی اِن ڈاکوؤں سے ملاقات ایک الگ ہی منظر رکھتی ہے۔

منظر نگاری نجیب صاحب کو بہت مرغوب ہے۔ تقریباً سبھی مضامین میں زمین کی کیفیت، درختوں پودوں کی تفصیلات اور نہایت احتیاط کے ساتھ ناپے ہوئے فاصلے ملتے ہیں۔ یہ چیزیں قاری کو درست ترین معلومات دینے کی کوشش ہیں۔

جو چیز اِن مضامین میں نایاب ہے وہ ہے ناشکری اور حسرت نگاری۔ پورے متن میں کہیں بھی ایسا احساس نہیں ہوتا کہ مصنف

کسی نعمت کی طلب میں موجود نعمتوں کی ناقدری یا ٹھکرانے کا مزاج یا رویہ رکھتا ہے۔ آج اقدار کے زوال آمادہ دور میں زبان سے اور زبانِ قلم سے ایسی باتیں نہ پھسلنا بلاشبہ ایک بڑی خوبی ہے۔

یہ واقعات پڑھتے ہوئے مجھے دفعتہً مرزا فرحت اللہ بیگ اور اُن کا یادگار خاکہ ''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی'' یاد آیا۔ مرزا صاحب اگرچہ اپنے استاد کے خاکے میں استاد سے ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہو گئے ہیں لیکن نجیب صاحب کا واقعہ سنانے کا انداز ویسا ہی مزے کا ہے جیسا مرزا صاحب کا ہے۔ مرزا صاحب کے برعکس موضوعِ خاکہ لوگوں کی انسانی خامیاں بتانے میں نجیب صاحب نے بین السطور کہنے کا فن انتہائی کامیابی سے استعمال کیا ہے۔ یوں یہ خاکے، حقیقی انسانوں کے سچے واقعات ہونے کے باوجود، اُن کے خاندانوں کے لیے ندامت کا باعث نہیں بن سکتے۔

نجیب صاحب کے پاس کہنے کو اور لکھنے کو بہت کچھ ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ آنے والے دنوں میں خاکوں کے کئی اور مجموعے بھی پیش کر سکیں گے۔ کہنے کو اور لکھنے کو بہت کچھ والی بات وہ اپنے ایک انگریزی مضمون میں لکھ بھی چکے ہیں۔ گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج بہاول پور کے آرگن ''نخلستانِ ادب'' کے جس کا انگریزی حصہ *The Oasis* کے نام سے شائع ہوتا ہے، ''خاکہ نمبر'' (ستمبر ۲۰۱۳ء) میں اپنے مضمون *Impressions* میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ:

> There is a multitude of memories; haunting furrows of my mind and bringing a poignant realization that in the manuscript of life, new chapters are always being added and none can be rewritten, yet we will live no other way and cherish the memories of the moments past.

ارتجالاً لکھے اِس مضمون میں اُنھوں نے میرے والد صاحب سے اُن کی زندگی کے آخری دن کی ملاقات کا ذکر یوں کیا ہے:

> Mr Abid Siddique was a venerable, saintly old man. He loved ideas and was always in search of words and expressions. To me, he asked in a deep sober voice, "Is it not time to meet my elders? Have I not done my part of living?" Death was etched in those eyes, as they stared blanky in space. Six hours later he was dead!

کتاب کا انتساب باجی نزہت کے نام ہے اور ایک خاکہ اُن کا بھی ہے۔ بے شک باجی نے خوب ساتھ نبھایا اور ایسی بیوی ثابت ہوئیں جن کے ساتھ اور احسانات سے نجیب صاحب کی زندگی میں بہت توازن رہا اور کامیابیاں ملیں۔ اُن کے دونوں بچے بہت اچھی تعلیم پا گئے اور آج نہایت کامیاب عملی زندگی گزار رہے ہیں۔ نجیب صاحب نے ایک خاکہ اپنے والد کا بھی لکھا ہے اور ایک میرے ابا جان کا۔ یہ سب خاکے ایسی براہِ راست معلومات سے بھرے ہوئے ہیں جو اِن سے قریبی تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں کے علم میں بھی نہ ہوں گی۔

یہ تحریر جسے میں نے یادنگاری کا نام دیا ہے، اِس سوال کے جواب پر مکمل کرتا ہوں کہ یادنگاری چوں کہ کوئی باقاعدہ صنفِ ادب نہیں ہے جب کہ خاکہ اور افسانہ باقاعدہ اصنافِ ادب ہیں، تو یہ مضامین آخر کس صنف کے تحت رکھے جائیں؟ میرا جواب ہے کہ

یہ مضامین سوانحی خاکے ہیں۔ جادو بیاں نجیب صاحب کا اسلوب افسانوی ہے جو اِن مضامین میں نہایت کامیابی کے ساتھ خاکہ نگاری کے لیے استعمال ہوا ہے۔

''یادیں: کچھ اپنی کچھ اوروں کی'' اردو میں لکھے خاکوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو بہاول پور سے محبت رکھنے والوں کے لیے اللہ بخش کے سوہن حلوے جیسی میٹھی سوغات ہے۔

❀❀

ذوالفقار علی بخاری ✿

سوشل میڈیا، ادیب اور ادب کا فروغ

سوشل میڈیا کی اصطلاح اُن ویب سائٹس اور ایپلی کیشنز کے لیے استعمال کی جاتی ہے جن کی بدولت لوگ باہمی رابطے نہ صرف کر سکتے ہیں بلکہ مخصوص مقاصد کے حصول کو بھی یقینی بناتے ہیں۔ سوشل میڈیا پیغام رسانی کے ساتھ ساتھ نظریات، تصاویر اور ویڈیوز کا اشتراک بھی ممکن بناتا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب لوگوں کو معلومات کے حصول کے لیے اخبارات، رسائل اور کتب خریدنی پڑتی تھیں۔ وقت نے ایسی کروٹ بدلی کہ آج ہر شخص کے ہاتھ میں موبائل ہے اور معلومات کا جہاں اُس کی دسترس میں ہے۔ اسمارٹ فون کو کئی لوگ بُرائی کی جڑ قرار دیتے ہیں لیکن اسی آلے کی بدولت سوشل میڈیا کی طاقت لوگوں کے ہاتھ میں آئی ہے۔ جس کے بعد سے ایک انقلاب برپا ہو چکا ہے۔ مصنوعات کی فروخت یا تشہیر کی بات ہو یا پھر خدمات کی، سوشل میڈیا ہر حوالے سے طاقتور میڈیم بن چکا ہے اور اِس کے بغیر بڑے پیمانے پر مقاصد کا حصول تقریباً ناممکن بن چکا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کی بدولت وسیع پیمانے پر لوگوں کی سوچ بدلی جا سکتی ہے اور مخصوص سوچ پیدا کی جا سکتی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

اگر ہم ادب کے حوالے سے بات کریں تو پہلے مختلف رسائل، اخبارات یا کتب میں اشتہارات دیکھنے کو ملتے تھے اور پتا چلتا تھا کہ کسی ادیب کی نئی کتاب سامنے آرہی ہے یا پھر کسی رسالے کا خاص نمبر شائع ہو رہا ہے۔ لیکن اب سوشل میڈیا کی بدولت فوری طور پر یہ علم ہو جاتا ہے کہ کتنے دنوں بعد اور کہاں سے کسی ادیب کی کتاب، ناول یا رسالے کا حصول ممکن ہو سکتا ہے اور کس نوعیت کے خاص نمبر منظرِ عام پر آرہے ہیں۔ دورِ حاضر میں سوشل میڈیا پر تشہیر کے ذریعے مختلف موضوعات پر تحریریں رسائل کے لیے منگوانے کے اعلانات کیے جاتے ہیں۔ ماضی کی بہ نسبت اب مدیران کے پاس تحریریں پہلے سے زیادہ آتی ہیں تاہم ان کے معیار پر بات کی جا سکتی ہے کہ وہ معیار سے کچھ گری ہوئی ہوتی ہیں۔ پہلے تحریریں ڈاک بروقت نہ پہنچنے پر کھو جایا کرتی تھیں لیکن اب ای میل ایک ایسا محفوظ ذریعہ ہے جس سے بروقت تحریریں ارسال کی جا سکتی ہیں جس کی وجہ سے رسائل کی تیاری بروقت کرنا ممکن ہو چکا ہے۔ ای میل کی بدولت دنیا کے کسی بھی کونے میں موجود ادیب اپنی تحریر فوری طور پر ارسال کر سکتا ہے جو کہ پہلے سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ کتاب میلے کی تشہیر جب بھی سوشل میڈیا کی بدولت ہوتی ہے اس کے بعد کئی نوجوان کتب کے حصول کے لیے کتاب میلوں کا رخ کرتے ہیں یعنی کہا جا سکتا ہے کہ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کا مثبت استعمال حوصلہ بخش نتائج سامنے لا رہا ہے۔

✿ این کے۔۱۹۰۔بی، نیو کٹاریاں، سیٹلائٹ ٹاؤن، راول پنڈی۔ فون: ۰۳۰۸۔۰۰۶۱۴۲۸

مختلف ادیب سوشل میڈیا کے بھرپور استعمال کی بدولت اپنی کتب کی تشہیر کچھ ایسے کرتے ہیں کہ اُن کی کتب کے ایڈیشنز ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہیں اور دوسری طرف قارئین کو باہمی رابطے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ پہلے قارئین کو معروف ادیبوں سے بات کرنے کے لیے خط لکھنا پڑتا تھا۔ سوشل میڈیا کی بدولت باہمی رابطہ آسان ہونے سے انھیں ادیب کی سوچ کے بارے میں فوری طور پر معلومات ملتی ہیں کہ وہ کس معاملے پر کیا نظریہ رکھتا ہے بلکہ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ ادب کے فروغ میں کس قدر سنجیدہ ہے اور دوسرے ادیبوں کے ساتھ کس طرح کے تعلقات ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ سوشل میڈیا کی بدولت قارئین کے لیے ادیبوں پر کڑی نگاہ رکھنا بھی ممکن ہو چکا ہے اور ادیبوں کے لیے بھی قارئین کی سوچ کا اندازہ لگانا آسان تر ہو گیا ہے۔ تاہم یہ ذہن نشین کر لیجیے کہ سوشل میڈیا پر جو دکھائی دے رہا ہے ویسا ہونا لازم نہیں ہے کہ کئی نئے لکھنے والوں کی کتب کی تشہیر ایسے ہوتی ہے کہ قارئین کتب پر لپکتے ہیں لیکن جب ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو انھیں بے حد مایوسی ہوتی ہے لہٰذا اس حوالے سے چوکنا رہنا چاہیے کہ تاہم نام اور ساکھ بنانے والے ادیبوں کی کتب کی تشہیر سے کبھی کبھی تاریخ ساز کتب کا حصول بے حد آسان ہو جاتا ہے اور کئی برس تلاش میں گزارنے والوں کو چند لمحوں میں کتب میسر ہو جاتی ہیں۔

سوشل میڈیا پر اگرچہ منفی اور پروپیگنڈے کے حامل مواد کو زیادہ شہرت ملتی ہے لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ سوشل میڈیا کا مثبت استعمال بہت کم ادیبوں کی جانب سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ کچھ ادیب اپنی ساکھ کو بدترین طریقے سے مجروح کرنے میں مصروف ہیں اور انھیں کوئی یہ بتانے والا نہیں ہے کہ اُن کی شناخت اور ساکھ جتنے برسوں میں کمائی گئی ہے، وہ دوسروں کے خلاف بے بنیاد، جھوٹی اور بے سروپا الزامات اور بچکانہ مواد پیش کرنے کی بدولت رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے اور یہی وہ عنصر ہے جو اُن کی مقبولیت میں کمی کے ساتھ ساتھ قارئین کو متنفر اور کتب کی فروخت کم کروا رہا ہے۔ اس حوالے سے ذمہ دارانہ رویہ اپنانے کی ضرورت ہے کہ سوشل میڈیا سب کچھ بے نقاب کرتا ہے اور پھر ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ سوشل میڈیا کی بدولت سب کی نظروں میں ''سچ'' ہوتا ہے لیکن لوگ خاموش رہتے ہیں کہ ''دیکھتے سب ہیں اور بولتا کوئی نہیں۔'' ادیبوں کو اپنی ساکھ کو بہتر بنانے کے لیے مثبت نظریات کا حامل مواد ہی سرِعام رکھنا چاہیے تاکہ ان کے قارئین کی تعداد بڑھے تاکہ اُن کی شخصیت متاثر کن محسوس ہو۔

ادب سے وابستگی کا تقاضا ہے کہ دوسرے ادیبوں کی سوشل میڈیا پر کہی جانے والی باتوں اور نظریات کے اختلاف کا حق آزادیٔ رائے کے تحت احترام کیا جائے اور اُن کے تقدس کو پامال نہ کیا جائے۔ اگر آسان لفظوں میں بات کی جائے تو یہی کہا جائے گا کہ اپنے مفادات کے حصول کے لیے دوسروں کی عزت کو تار تار نہ کیا جائے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ بے بنیاد الزامات کی بوچھاڑ کے بعد مخالف فریق سے معافی طلب کر لی جاتی ہے لیکن یہ سوچا نہیں جاتا ہے کہ اس سے عام قاری پر کتنے منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ منفی سوچ کے تابع نامور ادیب دوسروں کو طنز کا نشانہ بنانے میں مصروفِ عمل ہیں حالاں کہ انھیں اپنی ناموری کا احساس کرنا چاہیے کہ ادب سے وابستہ رہنے والوں کو کم سے کم سوچ کا احترام تو سیکھنا چاہیے۔ ادیب اگر مثبت انداز میں سوشل میڈیا کا استعمال کریں تو وہ دیگر تربیت کار افراد کی مانند اپنی ایک متاثر کن شناخت بنا سکتے ہیں اور اپنے قارئین کی تعداد میں خوب اضافہ کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیے شرط یہی ہے کہ سوشل میڈیا کا استعمال مناسب اور مثبت انداز میں کریں۔

راقم السطور کے مشاہدے میں آیا ہے کہ کچھ ادیبوں سے کسی معاملے میں سنجیدہ نوعیت کا سوال کیا جائے تب بھی وہ اُسے مذاق میں لے لیتے ہیں اور ایسا جواب دیتے ہیں جو کہ اُن کی ساکھ مجروح کرتا ہے لیکن انھیں اس چیز کا احساس نہیں ہے کہ اُن کے اس عمل سے کتنے لوگوں کی نظروں میں ساکھ مجروح ہوتی چلی جارہی ہے۔ راقم کے ذاتی تجربے میں آیا ہے کہ اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کی بجائے دوسروں کے خلاف مواد پہلے پوسٹ کردیا جاتا ہے تاکہ اس کی تذلیل کی جاسکے اور بعدازاں ہٹا دیا جاتا ہے۔ حالاں کہ اگر وہ مواد کسی کے خلاف برحق تھا تو اُسے ہٹانے کا فیصلہ غلط تھا اور اگر مواد غلط فہمی کی بنیاد پر لگا کر کسی کی عزت خراب کرنے کی کوشش کی جائے تو پھر یہ ایک عام قاری سوال کرسکتا ہے کہ آپ کیوں بطور ادیب غیر ذمے داری کا مظاہرہ کررہے تھے۔

سوشل میڈیا نے اردو زبان کے فروغ میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ اس کی بدولت اُن احباب کے نظریے کی موت واقع ہوئی ہے جو کہتے تھے کہ ''کچھ عرصہ بعد اردو کہیں دکھائی نہیں دے گی'' تو بے جا نہیں ہوگا۔ سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو انگریزی پر پوری دسترس نہیں رکھتے ہیں تو وہ اپنا مافی الضمیر اردو زبان میں پیش کرکے فروغ کا سبب بن رہے ہیں۔ سوشل میڈیا پر اگرچہ بے سروپا شاعری اور اغلاط سے بھرپور نثر بھی دکھائی دیتی ہے لیکن ایسا کرنے والوں کو روکنے کی بجائے اُن کی اصلاح کی ضرورت ہے تاکہ وہ مزید توانائی سے ادب کے فروغ کے لیے کام کریں۔ یہ عنصر قابل مسرت ہے کہ نوجوان نسل اردو لکھنے اور پڑھنے میں کم سے کم سوشل میڈیا کی حد تک دل چسپی لے رہی ہے۔

پاکستان میں ۲۰۲۱ کے بعد سے ادب اطفال کا بھرپور فروغ سوشل میڈیا کی بدولت ممکن ہوا ہے اور اب کئی نوجوان صاحب قلم اپنی تحریریں پیش کرکے تعریف اور تنقید وصول کرتے ہیں۔ کئی شاعری اور افسانوں کے مقابلے اب ادبی تنظیمیں سوشل میڈیا (بالخصوص فیس بک/واٹس ایپ گروپ) میں کروا رہی ہیں۔ معروف بھارتی واٹس ایپ محفل ''بچپن'' کا تذکرہ بے حد ضروری ہے کہ اس وقت فروغ ادب اطفال کے حوالے سے برصغیر میں بہت سرگرم ہے جس میں دنیائے ادب اطفال کے نئے اور نامور ادیب شامل ہیں اور اس محفل میں پیش کی جانے والی تحریریں بھارتی رسائل و جرائد کا حصہ بن رہی ہیں۔ اس محفل کے ذریعے نئے ادیبوں کی رہنمائی بھی کی جاتی ہیں اور انھیں آگے بڑھنے کے لیے بھرپور حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ بچپن محفل کا ایک دل چسپ سلسلہ تحریری انٹرویو ہے جو پاکستان اور بھارت کی معروف علمی و ادبی شخصیات سے لیا جاتا ہے۔ اس محفل کے روح رواں جناب سراج عظیم صاحب ہیں جو کہ کئی حوالوں سے شہرت رکھتے ہیں اور لاتعداد کتب کے مصنف ہیں۔ ''ادیب نگر'' محترمہ تسنیم جعفری کی سرپرستی میں ادب اطفال کے فروغ میں مصروف عمل ہے۔ تسنیم جعفری صاحبہ سائنس فکشن کے حوالے سے شہرت رکھتی ہیں اور آپ کی کئی کتب اور ناولز منظر عام پر آچکے ہیں۔ ''ادیب نگر'' کے زیرِ اہتمام کئی مقابلے کروائے جاچکے ہیں۔ ایک معروف نام ''سرائے اردو۔ ادبی فورم'' کا بھی ہے جس کے زیرِ اہتمام اشاعتی ادارہ تاحال ۸۰ سے زائد کتب شائع کرچکا ہے جن میں نئے لکھنے والوں کی کثیر تعداد شامل ہے۔ سرائے اردو پبلی کیشن سے اس وقت دو سہ ماہی رسائل ''باغیچہ اطفال'' اور ''سرائے اردو'' شائع ہورہے ہیں۔ لائیو گوگل میٹ پروگرامز کا انعقاد کچھ یوں منفرد رہا کہ پاکستان اور بھارت سے احباب شریک ہوئے اور مشاعرہ برائے اطفال کا انعقاد بھی ممکن ہوا۔ سوشل میڈیا کی بدولت معرض وجود میں آنے والا سرائے اردو ادبی فورم دل چسپ موضوعات پر کئی مقابلے کروا چکا ہے۔ ان میں:

☆ عید کہانی مقابلہ

☆ دفاعِ وطن۔افسانہ نگاری مقابلہ

☆ جاسوسی کہانی مقابلہ

☆ سفرنامہ مقابلہ

☆ تشہیر کہانی مقابلہ

☆ مختصر آپ بیتی مقابلہ کامیاب ترین مقابلے قرار دیے جاسکتے ہیں۔

''مختصر آپ بیتی'' مقابلے میں پچاس سے زائد اور ''عید کہانی'' مقابلے میں ستر سے زائد تحریریں محض تین دنوں میں مقابلے میں پیش ہوئیں جن میں بھارت کے ادیب بھی شامل تھے۔دل چسپ امر یہ ہے کہ اِن مقابلوں کی بدولت کئی نوجوان قلم کار سامنے آئے ہیں جنھوں نے افسانچہ نگاری، ادبِ اطفال اور شاعری کے میدان میں اپنی ایک پہچان بنائی ہے۔آخر الذکر مقابلے (مختصر آپ بیتی) میں شامل آپ بیتیوں پر مبنی خاص نمبر ''مختصر آپ بیتیاں نمبر ۱'' ماہ نامہ ''انوکھی کہانیاں''، کراچی کے دسمبر ۲۰۲۱ اور ''مختصر آپ بیتیاں نمبر ۲'' جنوری ۲۰۲۲ کے شمارے میں شائع ہوئیں۔یہ غالباً اولین موقع تھا جب سوشل میڈیا پر ہونے والے مقابلوں کی تحریریں کسی ماہ نامہ جریدے کا حصہ بنی ہیں۔سرائے اردو نونہالوں سے لیے گئے انٹرویوز بھی یوٹیوب کی زینت بنانے کا سلسلہ شروع کر چکا ہے جو مطالعے میں دل چسپی رکھتے ہیں۔اسی طرح کی تحریک دیگر ادارے شروع کریں تو وہ وقت دور نہیں جب نونہالوں کو کتاب بینی کی جانب مائل کیا جاسکے۔بچوں کے لیے دل چسپ کہانیاں اور بڑوں کے لیے نامور ادیبوں کے افسانے اگر جدید تکنیکی سہولیات کو اپنا کر پیش کیے جائیں تو بڑی تعداد میں لوگ اس کی جانب مبذول ہو سکتے ہیں۔اردو زبان کے فروغ کے لیے سوشل میڈیا کا انسانی نفسیات کو سمجھ کر استعمال کیا جائے تو دوررس نتائج حاصل ہو سکتے ہیں لیکن اس کے لیے باقاعدہ حکمتِ عملی بنانی ہوگی۔اس وقت کئی ادبی تنظیمیں اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے سوشل میڈیا کا سہارا لے چکے ہیں اور اپنا کردار ادا کرنے میں مگن ہیں۔سوشل میڈیا کی آمد سے قبل کئی نوجوانوں کے پاس اپنی صلاحیتوں کو منوانے کے لیے کوئی پلیٹ فورم نہیں تھا۔انھوں نے اِس کے ذریعے اپنا آپ منوانا شروع کیا ہے جس میں افسانہ نگار اور شعرا زیادہ اہمیت کے حامل ہیں کہ اسی کی بدولت عزت و احترام ملا ہے جس کی وجہ سے کئی ایسے ادیب اور شعرا جو سوشل میڈیا کو اپنے لیے زہرِ قاتل سمجھتے ہیں، وہ انھیں پذیرائی دینے سے کتراتے ہیں۔اس کی مثال کچھ یوں دینا چاہوں گا کہ ایک کتاب میں ایک ادیب کا تعارف فیس بک دوست کے طور پر کرایا گیا۔یہ پیش لفظ لکھنے والے ادیب کی سوچ کو بہ خوبی عیاں کرتا ہے۔درحقیقت قارئین کے وسیع حلقے کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانا اتنا آسان نہیں ہے کہ معیاری اور متاثر کن تحریریں ہی کسی کی پہچان بنتی ہیں اور اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جب قارئین کی بڑی تعداد تک لکھا ہوا پہنچتا ہے تو اُس میں ہر طرزِ فکر کے احباب شامل ہوتے ہیں جنھیں اپنی سوچ کے مطابق کچھ اچھا لگے گا تو وہ وہی پسند کرے گا۔

بقول سید اقبال حیدر:

آج سوشل میڈیا پر جرات اتنی بڑھ گئی ہے مختلف تحریروں میں قرآن، بائیبل اور دوسری مقدس

کتابوں کا کوئی بھی حوالہ دے کر صفحہ نمبر دے کر کچھ بھی لکھا جا رہا ہے، تو ایسے میں کتنے لوگ ہیں جو ان صفحات پر جائیں گے، اُن حوالوں کو کتابیں کھول کر پڑھیں گے اب ایسے جعلساز لوگوں کو جواب کون دے گا، یہاں ادیبوں کی اہم اور اٹل ذمہ داری ہے کہ عوام الناس کو ان غلط حوالوں سے لکھی گئی تحریروں کے غلط ہونے کی آگاہی دیں کہ، اس طرح کی غلط قسم کی تحریروں سے انسان کا شعور یا لاشعور متاثر ہو رہا ہے، اخلاق متاثر ہو رہا ہے، نظریات متاثر ہو رہے ہیں اس کا گھر اس کا محلہ اس کا شہر اس کا ملک متاثر ہو رہا ہے، اس کی آئندہ نسل متاثر ہو رہی ہے، ادیبوں کو چاہیے ان تمام تحریروں کے خلاف ردِّعمل نہایت نفاست اور پیار سے لکھا جائے، گالی کے عوض گالی نہیں بلکہ اظہار خیال بہت نرمی سے کرتے ہوئے بات کو سمجھانا ہے کہ یہ خبر غلط ہے جھوٹی ہے، تحقیق شدہ نہیں ہے اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے مگر ہماری جوابی تحریر دل نشین ہونی چاہیے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ سوشل میڈیا پر وہی کامیاب ہے جس کا مواد بے پناہ متاثر کن ہوگا، آپ سوشل میڈیا پر شہرت حاصل کرنے والوں کا مواد دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے کچھ منفرد پیش کیا تب ہی وہ نظروں میں آئے ہیں، البتہ راقم السطور یہ ہرگز نہیں کہے گا کہ سوشل میڈیا پر جتنی بھی تحریریں (بشمول شعروشاعری، افسانے وغیرہ) پیش ہوتی ہیں وہ سب معیاری ہوتی ہیں اِن کے بارے میں پڑھنے والوں کی رائے کا احترام کرنا بہت ضروری ہے۔ سوشل میڈیا کی اہمیت کا اندازہ اِس بات سے بھی بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ اُن رسائل اور اخبارات سے زیادہ لوگوں تک پہنچتا ہے جتنے دورِ حاضر کے رسائل واخبارات کے مستقل قارئین ہیں۔ یعنی کہا جاسکتا ہے کہ اچھے اور بہترین لکھنے والوں کے پاس اب اتنے ذرائع ہیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو منوا سکتے ہیں لیکن اس کے لیے معیاری اور اچھا لکھنا ضروری ہے کہ وہی قارئین کو اُن کی جانب مائل کرے گا اور وہ انھیں پڑھنا پسند کریں گے۔

جن ادیبوں نے سوشل میڈیا کی طاقت کو نظرانداز کیا ہے انھیں یہ سوچنا چاہیے کہ اگر وہ وقت کے ساتھ نہیں چلیں گے تو پھر ''خالی میدان'' پر کوئی اور آئے گا اور اپنی ''صلاحیتوں کا سکّہ منوا کر قارئین کے دلوں پر راج کرے گا۔ سوشل میڈیا ہر باصلاحیت ادیب کے لیے ایک کھلا میدان ہے جس میں اپنی صلاحیتوں کو منوانے والے کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ یہاں دل چسپ امر یہ ہے کہ جس طرح کوئی رسائل واخبارات میں ہر ماہ اپنی تحریر شائع کروا کر اپنا نام بنا سکتا ہے اسی طرح کوئی صاحب قلم اچھی اور معیاری تحریریں متواتر پیش کر کے شہرت کما سکتا ہے لیکن اس کے لیے معیاری اور مسلسل اچھا لکھنا ضروری ہے۔

ساجد حمید اپنے مضمون ''اردو زبان و ادب اور سوشل میڈیا: نئے امکانات'' میں لکھتے ہیں کہ ''سوشل میڈیا کے یہ سب ذرائع اپنی بات کہنے اور آگے بڑھانے کے نئے امکانات ہیں۔ ہم سارا دن منفی باتیں کرتے ہیں اور مایوسیوں کا زہر ایک دوسرے کے کانوں میں انڈیلتے ہیں۔ سوشل میڈیا کو گٹر میڈیا اور نجانے کیا کیا کہتے رہتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کبھی چند لمحوں کے لیے رک کر ان مثبت نکات پر بھی نظر ڈال لیں۔ سب کچھ غلط اور منفی نہیں ہو رہا۔ ٹیکنالوجی کا مثبت استعمال بھی ہو رہا ہے۔ ہمیں صرف اپنا حصہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔''

سوشل میڈیا ادیبوں کے لیے ایک ایسا پلیٹ فورم ہے جہاں کوئی مدیر نہیں ہے جو کسی تحریر کو روک سکے یا نا قابلِ اشاعت قرار دے یا پھر اُن کی نوک پلک درست کرے یعنی جو جیسا ہے، ویسا ہی رہے گا اور لکھنے والوں کو اپنے لکھے پر تعریف اور تنقید حاصل ہوگی یا پھر بکی کا سامنا کرنا پڑے گا۔لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں سوشل میڈیا ادب کے فروغ کو یقینی بنا رہا ہے اور ادیبوں کی پہچان کا سبب بن رہا ہے، وہیں وہ انھیں قارئین کی عدالت میں فوراً پیش کرتا ہے یعنی ادیبوں کو سوشل میڈیا کو استعمال کرتے ہوئے ذمے داری کا مظاہرہ کرنا پڑے گا تاکہ قلم کی حرمت و تقدس برقرار رہے اور ادب کا فروغ بھی جاری رہے۔

مآخذ

۱۔ سرائے اردو، www.facebook.com/groups/saraiurdu

۲۔ ''مختصر آپ بیتیاں نمبر ۱''، مشمولہ ماہ نامہ ''انوکھی کہانیاں''، کراچی، دسمبر ۲۰۲۱ء

۳۔ ''مختصر آپ بیتیاں نمبر ۲، ایضاً، جنوری ۲۰۲۲ء

۴۔ سیّد اقبال حیدر، ''سوشل اور الیکٹرانک میڈیا، ادیبوں کی ذمہ داریاں''، دیکھیے: https://jang.com.pk/news/826552

۵۔ ساجد حمید، ''اردو زبان و ادب اور سوشل میڈیا نئے امکانات''، دیکھیے: www.adbimiras.com

۶۔ ادیب نگر، www.facebook.com/groups/677740402676631

محمد عارف اقبال ❁

الف لیلہ ولیلہ: تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

ہندوستان میں آزادی سے چند سال قبل یعنی ۱۹۴۰۔۴۶ء کے درمیان میں مولوی عبدالحق کی سرپرستی اور انجمن ترقی اردو، نئی دہلی کے زیر اہتمام ''الف لیلہ ولیلہ'' کی مکمل کہانیاں (ایک ہزار ایک داستان) سات جلدوں میں شائع ہوئی تھیں۔ یہ ساتوں جلدیں اب نایاب ہیں۔ اس کے مترجم ڈاکٹر ابوالحسن منصور احمد تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس پر انجمن ترقی اردو یا مترجم کی طرف سے کوئی ''پیش لفظ'' نہیں ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ کس زبان سے کیا گیا ہے۔ تاہم غالب امکان ہے کہ ڈاکٹر ابوالحسن نے عربی متن سے ترجمہ کیا ہوگا۔[1]

معروف ادیب ومحقق اور نقاد پروفیسر حنیف نقوی (۱۷/اکتوبر ۱۹۳۶ء۔ ۲۲/دسمبر ۲۰۱۲ء) نے اپنے ایک تحقیقی مضمون ''شبستانِ سرور کا ماخذ'' میں لکھا ہے:

> ''الف لیلہ صحائف آسمانی کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی معدودِ چند کتابوں میں سے ایک ہے، اس پر مستزاد یہ کہ اس کے قارئین کا دائرہ کسی خاص طبقے یا علاقے تک محدود نہیں۔ اصل کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، عربی زبان میں ہے[2] لیکن دنیا کی تقریباً ہر بڑی زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس غیر معمولی شہرت ومقبولیت کے باوجود یہ مسئلہ آج بھی تحقیق طلب ہے کہ اس کا اصل مصنف کون ہے، یہ کس زمانے میں لکھی گئی اور اس میں اصلاً کل کتنی کہانیاں شامل تھیں؟'' (تحقیق وتعارف)

پروفیسر حنیف نقوی اسی مضمون میں آگے لکھتے ہیں:

> فرانسیسی مترجم آں تونے گالاں (Antoine Galland) وہ پہلا شخص ہے جس نے سمرنا یا قسطنطنیہ سے اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ حاصل کر کے ۱۷۰۴ء کے آس پاس فرانسیسی میں اس کا ترجمہ کرنا شروع کیا اور ۱۷۱۵ء تک اس کی دس جلدیں مکمل کر کے انھیں شائع کر دیا۔ اسی سال اس کی وفات ہوگئی۔ اس کے بعد اس کے چھوڑے ہوئے مسودات سے اگلے دو برسوں میں اس کی مزید دو جلدیں مرتب کر کے شائع کر دی گئیں۔ بارہ جلدوں پر مشتمل گالاں کا یہ ترجمہ مغرب ومشرق میں اس کتاب

❁ مدیر، ''اردو بک ریویو''، نئی دہلی، ہندوستان، برقی پتا: urdubookreview1995@gmail.com

کی شہرتِ عام اور اس کی طرف قارئین کے روز افزوں اشتیاق کے لیے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔(۳)

پس منظر

روبرٹ ارون (Robert Irwin) کے بقول گالاں (Antoine Galland) پہلا شخص تھا جس نے یورپ میں اس طرح کی کہانیوں کی کھوج کی۔ اس لیے ارون کے نزدیک گالاں کو Arabian Nights کا حقیقی مصنف (Real Author) بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود ''الف لیلہ ولیلہ'' کا ''حقیقی مصنف'' آج بھی گمنام ہے لیکن گالاں کے Les Mille et Une Nuits کی اشاعت کے بعد اس کا ترجمہ یوروپ میں انگریزی، جرمنی، اطالوی کے علاوہ روسی اور دیگر متعدد زبانوں میں ہوا۔ اس سے یوروپ ہی نہیں بلکہ دیگر براعظموں میں بھی ''الف لیلہ ولیلہ'' کی کہانیوں کی دھوم مچ گئی۔ کہا جاتا ہے کہ گالاں کے اس ترجمے سے یوروپ نے مشرق کی تقلید کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ وکٹورین عہد میں برٹش مصنفوں کے نزدیک *Arabian Nights* ایک مرغوب کتاب سمجھی جاتی تھی۔ جدید انگریزی مصنفوں کا خیال ہے کہ کولرج (Coleridge: 1772-1834) اور تھامس ڈی کوئنسی Thamas de Quincey (1785-1859) کی سوانحی تحریروں میں بھی 'الف لیلہ' کا ذکر ملتا ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ انگریزی کے معروف شعرا ورڈز ورتھ (1770-1850) Wordsworth اور ٹینی سن (1809-1892) Tennyson نے اپنے لڑکپن کی شاعری میں اس کی کہانیوں کے مطالعے کا اعتراف کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مغرب میں الہ دین کا چراغ، علی بابا اور سندباد جہازی کی کہانیوں کو بے حد اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ کردار وہاں کے عوام میں بھی بے حد مقبول رہے ہیں۔

''الف لیلہ ولیلہ'' کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ایک مکمل تہذیب کی تصنیف ہے۔ اس کا شمار ان معدودِ چند کتابوں میں ہوتا ہے جس نے ایک وطن میں جنم لیا لیکن اس کا خمیر عالم گیر ہے۔ اس کا گھر اگرچہ ایک مخصوص تہذیب سے عبارت ہے لیکن اس کی کہانیاں کہتی ہیں کہ اس کا وطن ساری دنیا ہے۔ اس کی مثال یونانی فلسفہ سے دی جاسکتی ہے جس نے ساری دنیا کو اپنے فلسفے کا اسیر کرلیا۔ اسی طرح الف لیلہ ولیلہ کی کہانیاں پوری دنیا کی تہذیب اور ادب میں واضح طور پر محسوس کی جاتی ہیں۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ابھی تک اس کے مصنف کے خانے میں نامعلوم درج ہے۔ بیسویں صدی کے مغربی اسکالرز اس بات پر متفق ہیں کہ ''الف لیلہ و لیلہ'' کی تالیف میں ایک سے زائد افراد کا حصہ ہے۔ کئی صدیوں کی داستان گوئی نے اس مجموعے کی تخلیق میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کہانیوں کا مرکز اگرچہ سنٹرل ایشیا ہے تاہم ہندوستان اور چین کے جزائر ان کہانیوں میں موجود ہیں۔

ستار طاہر لکھتے ہیں:

> ''الف لیلہ ولیلہ کی دنیا میں اس کے کرداروں میں تکلف کا وجود نہیں ہے۔ اس کی کہانیاں مشرقی ممالک کی کہانیوں اور قصوں سے الگ ہیں جن میں عام طور پر پند و نصائح اور وعظ و تلقین کی زیریں لہریں موجود ہوتی ہیں۔ الف لیلہ ولیلہ کی کہانیوں میں ان کا سرے سے وجود نہیں ہے۔ ان کہانیوں

میں کوئی اخلاقی معیار انسانی فطرت کے اظہار کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ انسان کو معروضی طور پر دیکھنے اور سمجھنے کی جو کشش الف لیلہ ولیلہ میں ملتی ہے، وہ بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ بیسویں صدی کے مغربی فکشن کا بڑا وصف یہی ہے کہ جو الف لیلہ کی کہانیوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔'' (دنیا کی سوعظیم کتابیں)

واضح ہو کہ مغربی تہذیب وثقافت میں الف لیلہ ولیلہ کے بہت سے کردار اب Cultural Icons (ثقافتی عقائد) کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ مثلاً الہ دین، علی بابا، سندباد جہازی، طلسمی گھوڑا اور شہزادہ فیروز وغیرہ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عربی زبان میں اس کی تخلیق کے دعویٰ کے باوجود محققین کے نزدیک عالم عرب میں الف لیلہ ولیلہ کی کہانیوں کی موجودگی کے شواہد نہیں ملتے۔ عربی ادب میں اٹھارہویں صدی سے قبل کے ادبیات میں اس کی موجودگی نہیں پائی جاتی۔ کیوں کہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہاں شاعری کا رجحان زیادہ رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہاں اس کی کہانیوں کو 'خرافات' کا درجہ حاصل تھا۔ *The Arabian Nights: A Companion* (2003) کے مصنف روبرٹ ارون (Robert Irwin) کے بقول چند ادیبوں کو چھوڑ کر الف لیلہ ولیلہ کی کہانیوں میں دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد نہیں کے برابر ہے۔ کیوں کہ عربوں کے خیال میں یہ کہانیاں عام طور پر 'فحش اور بچکانہ' تصور کی جاتی تھیں۔ اس کی کہانیاں صرف چند جدید مصری ادیبوں کو متوجہ کر سکیں جن میں توفیق الحکیم، طٰہٰ حسین اور نجیب محفوظ شامل ہیں۔

عالمی ادب پر 'الف لیلہ ولیلہ' کے اثرات

'الف لیلہ ولیلہ' نے عالمی ادب پر کیا اثرات مرتب کیے، اس ضمن میں کہا جاتا ہے کہ معروف ناول نگار ہنری فیلڈنگ (Henry Fielding: 1707-1754) سے لے کر مصری ادیب و ناول نگار نجیب محفوظ تک یہ سلسلہ دراز ہے۔ تاہم یہ بات وثوق سے کہی جاتی ہے کہ مغرب کے بہت سے جدید اسکالرز کے علاوہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے معروف مصنفوں کی تخلیقات میں بھی 'الف لیلہ و لیلہ' کے اثرات نمایاں طور پر محسوس کیے گئے ہیں۔ چند نام ملاحظہ کریں:

- جرمن مصنف گوئٹے (Goethe: 1749-1832)
- انگریزی ناول نگار سر والٹر اسکاٹ (Sir Walter Scott: 1771-1832)
- فرانسیسی مصنف (Stendhal (1783-1842، اصل نام Marie Henry Beyle
- روسی ناول نگار پشکن (A.S. Pushkin: 1799-1837)
- فرانسیسی ناول نگار (Gustave Flaubert (1821-1880
- انگریزی مصنف (W.M. Thackeray (1811-1863
- انگریزی جاسوسی ناول نگار (William Wilkie Collins (1824-1889
- انگریزی خاتون ناول نگار (Elizabeth C.Gaskell (1810-1870۔ (Gaskell لندن کے ایک وزیر کی بیٹی تھی۔)

- فرانسیسی ناول نگار Alexandre Dumas (1803-1865)
- معروف برٹش مصنف، مستشرق اور ۱۶ جلدوں میں *The Arabian Nights* کے انگریزی مترجم Sir Richard Francis Burton (1821-1890)۔ Burton نے ۱۸۵۳ء میں ایک پٹھان مسلم کے بھیس میں مکۃ المکرمہ اور مدینۃ النبیؐ کا سفر کیا تھا۔ ۱۸۵۵ء میں جب اُس کی کتاب *The Pilgrimage to Al-Madinah and Meccah* شائع ہوئی تو یہ انکشاف ہوا تھا۔
- *War and Peace* کے روسی مصنف ٹالسٹائی (Count Leo N.Tolstoy: 1828-1910)
- معروف انگریزی فکشن رائٹر اور 'شرلاک ہومز' کے خالق Sir Arthur Conan Doyle (1859-1930)
- آئرلینڈ کا معروف شاعر ایٹس (W.B. Yeats: 1865-1939)
- انگریزی مصنف Herbert George Wells (1866-1946)
(ان کی تخلیقات میں *The Time Machine* اور *The Invisible Man* شامل ہیں۔)
- فرانسیسی ناول نگار Marcel Proust (1871-1922)

معروف انگریزی میگزین ''آوٹ لک'' (Out Look) کا New Year شمارہ (۱۲رجنوری ۲۰۱۵ء) ایک سو بہترین کتابوں کے تعارف پر مشتمل ہے۔ اس کے سرورق کی ہیڈنگ کچھ اس طرح ہے: 100 Books That can change your life۔ انگریزی میں ان ایک سو بہترین کتابوں میں *The Arabian Nights* کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ گزشتہ دو دہائیوں میں 'الف لیلہ و لیلہ' کے موضوع پر بین الاقوامی سطح پر انگریزی میں کتابوں کے علاوہ اہم انگریزی مجلات اور یونی ورسٹی انسائیکلو پیڈیا میں تحقیقی مقالات شائع ہو رہے ہیں۔ (wikipedia)

''الف لیلہ و لیلہ'' یعنی The Thousand and One Nights پر اردو ادب کے برعکس انگریزی میں مسلسل تحقیقی کام ہو رہے ہیں اور مختلف انداز میں اس کی کہانیوں کے مجموعے کی اشاعت بھی ہو رہی ہے۔ چند تحقیقی کتابوں کے نام ملاحظہ کیجیے:

- *In Arabian Nights: A search for Morocco through its Stories and Storytellers* by Tahir Shah, Double day, 2008.
- *The Islamic Context of the Thousand and One Nights* by Muhsin J. al-Musawi, Columbia University Press, 2009.
- *Eastern Dreams: How the Arabian Nights come to the World* by Paul McMichael, Viking Canada, 2010.
- *A Thousand and One Nights: A History of the Text and its Reception* in the *Cambridge History of Arabic Literature*, Vol. 6. (OUP, 2006) by Dwight Reynolds.
- *The Arabian Nights Reader* by Ulrich Marzolph, 2006, Wayne State University Press.
- *Essays on the Arabian Nights* edited by Rizwanur Rahman, Syed Akhtar Husain, 2015, Primus Books, New Delhi.

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ گزشتہ ایک صدی میں 'الف لیلہ ولیلہ' کی بعض کہانیوں اور کرداروں پر ۱۹۲۴ء سے فلمیں بنائی جاتی رہی ہیں اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ ٹیلی فلمز اور کارٹون بنائے گئے۔ میوزک البم بھی لانچ کیے گئے۔ اس سلسلے میں مغربی مصنفوں اور فلم پروڈیوسرز کی بڑی خدمات ہیں۔ اس کے برعکس مشرق میں محض مغرب کی تقلید ہے اور اس میدان میں بھی مشرق بہت پس ماندہ ہے۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ بالی ووڈ کے ایک پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کو 'الف لیلہ' کا درست تلفظ بھی نہیں معلوم ہے۔ وہ Alf کو Alif کہتے ہیں حالاں کہ Alif (الف) حروف تہجی کا پہلا 'حرف' ہے اور عربی لفظ Alf کا مفہوم ہزار (Thousand) ہوتا ہے۔

پروفیسر حنیف نقوی نے لکھا ہے کہ ''۱۷۰۴ء میں گالاں کے ترجمے کی پہلی جلد کی اشاعت کے اٹھانوے سال بعد ۱۸۰۲ء میں ایڈورڈ فارسٹر (Edward Forster) کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا جو پانچ جلدوں پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد جرمنی، فرانسیسی، انگریزی اور دنیا کی دوسری مقبول زبانوں میں اس کتاب کے نو بہ نو ترجموں اور ان کے خلاصوں کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ کسی بڑے وقفے کے بغیر آج تک جاری ہے۔ رولاں شمل فرنگ (Roland Schimmelpfennig) کی *Arabian Nights* اور مارگریٹ کے سوئفر (Margaret K. Soifer) کی *Golden Tales from Arabian Nights*، جن کا سالِ اشاعت ۲۰۰۳ء ہے، اس دعوے کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔''(۴) (تحقیق وتعارف)

تاہم محققین کے نزدیک عالمی ادب میں ''الف لیلہ ولیلہ'' کی کہانیوں کے اثرات ۱۷۰۴ء میں فرانسیسی مترجم گالاں (Galland) سے قبل ہی موجود تھے۔ خاص طور سے اسپین میں عیسائی یا یہودی مصنفوں نے عربی میں جن کتابوں کے ترجمے کیے ان میں اگرچہ بنیادی طور پر ریاضی اور فلسفہ کے علوم ملتے ہیں لیکن عرب فکشن کی موجودگی کا اندازہ Juan Manuel کی کہانیوں کا مجموعہ *The Book of Beasts* سے ہوتا ہے۔ اس طرح کے کام خاص طور پر اسپین میں انجام دیے گئے اور وہیں سے اسپین کے باہر یہ کہانیاں متعارف ہوئیں۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ انگریزی مصنف و مترجم (1340-1400) Geoffrey Chaucer کے *The Canterbury Tales* میں ''الف لیلہ ولیلہ'' کی کہانی موجود ہے۔ ایک کہانی میں ہیرو تانبے کے گھوڑے پر پرواز کرتا ہے۔ یہ شواہد بھی ملتے ہیں کہ ''الف لیلہ ولیلہ'' کی کہانیاں بلقان اور رومانیہ کے باشندوں میں ۱۷ویں صدی تک عام تھیں جو الف لیلہ کے یونانی ورژن کے ذریعے پہنچیں۔ اسی طرح ۱۸ویں صدی سے یوروپ میں کہانیوں کے مجموعوں اور کلاسیکی کامکس (Classical Comics) کی کتابیں چھپ چکی تھیں۔ *The Story of the Magic Horse* کے ساتھ *Arabian Nights* کی کہانیاں کلاسیکی کامکس کے تحت مسلسل شائع ہوتی رہیں۔

''الف لیلہ ولیلہ'' کے تاریخی پس منظر سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک مخصوص تہذیب وثقافت سے وابستہ یہ مشرقی کہانیاں سب سے زیادہ یوروپ میں مقبول ہوئیں اور خاص طور پر وہاں کا ادبی حلقہ اس سے بے حد متاثر ہوا۔ معروف انگریزی ناول نگار چارلس ڈیکنس (Charles Dickens: 1812-1870) ایک ایسا پُرجوش مصنف تھا جس نے ۱۸۷۰ء میں اپنا آخری نامکمل ناول *Mystry of Edwin Drood* لکھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے آغاز میں 'الف لیلہ' کی واضح جھلکیاں ملتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ امریکی مصنف و شاعر ایڈگر ایلن پو (Edgar Allan Poe: 1809-1849) نے ۱۸۴۵ء میں ایک کتاب *The Thousand and Second*

Tale of Scheherzade بھی لکھی جس میں سند باد جہازی (Sindbad the Sailor) کے آٹھواں اور آخری سفر کا تذکرہ ہے۔ اس میں سند باد اور اس کے ساتھیوں کی محیر العقول داستانیں بیان کی گئی ہیں۔

اسی طرح ہندوستان میں ملیالم، تمل اور سنسکرت ادب میں بھی ''الف لیلہ'' کے اثرات محسوس کیے گئے۔ ملیشیا اور ترکیہ کی ادبی و ثقافتی روایات میں 'الف لیلہ' کو قبول عام حاصل ہوا۔ حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب *Essays on the Arabian Nights* میں ایک تحقیقی مقالہ *Magic to Japan*، جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی کے استاد جن شروتی چندر کا ہے۔ ایک دوسرا مقالہ *1001 Nights: Its Reception in Russia* ہے جس کے لکھنے والے جے این یو کے پروفیسر نصر شکیل رومی ہیں۔ ان تحقیقی مقالات سے ''الف لیلہ ولیلہ'' کی عالمی مقبولیت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ اس کتاب کا پہلا تحقیقی مقالہ فرانس کے پروفیسر *Jean Jacques Thibon* کا ہے جو بے حد چونکانے والا ہے۔ مقالہ کا عنوان ہے: *Presence of Sufi Teachings and Practices in some Tales of the Arabian Nights*۔

اس عالمانہ مقالے میں مقالہ نگار نے 'الف لیلہ' کی کہانیوں کا بڑی گہرائی اور دقت نظری سے جائزہ لیتے ہوئے ان میں صوفی تعلیمات اور اشغال کی نشان دہی کی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''الف لیلہ ولیلہ'' کے کتنے زاویے اور کتنے رنگ ہیں۔

'الف لیلہ ولیلہ' میں کہانیوں کی تکنیک

''الف لیلہ ولیلہ'' کی کہانیوں میں داستان در داستان کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تکنیک فارس (قدیم ایران) اور ہندوستان کی داستانی روایات سے ماخوذ ہے۔ ''الف لیلہ ولیلہ'' کی کہانیوں میں تکنیک کے حوالے سے اگر ہم پیچھے کی طرف لوٹتے ہیں تو ہمیں ایک اہم کتاب ''کلیلہ و دمنہ'' نظر آتی ہے۔ ''کلیلہ و دمنہ'' کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ داستان در داستان کی تکنیک سے دنیائے ادب پہلی بار اس کتاب کے حوالے سے متعارف ہوئی ہے اور الف لیلہ اور ہزار داستان پر اس کے اثرات صاف دکھائی دیتے ہیں۔

''کلیلہ و دمنہ'' کے متعلق یہ بھی خیال ہے کہ اس کا اصل ماخذ سنسکرت ہے۔ ابوریحان البیرونی ''کلیلہ و دمنہ'' کا ماخذ 'پنچ تنتر' قرار دیتا ہے جو حکایات و امثال کا مجموعہ ہے۔ لیکن جدید تحقیقات اس کے خلاف ہیں۔ پروفیسر لی بان ''حکایاتِ لقمان'' کا ماخذ بھی اسی کتاب کو قرار دیتا ہے۔ ''کلیلہ ودمنہ'' وہ کلاسیکی کتاب ہے جس میں جانوروں کی زبان سے معاشرتی آداب، تدبیر و تقدیر اور آئین جہاں داری کے اصول، داستان کے پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔ دنیا کی تمام مہذب زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ یہ کتاب ادب کے ہر شعبے اور ادبی تحریکوں پر اثر انداز ہوتی رہی۔ کہا جاتا ہے کہ نوشیرواں کے زمانۂ حکومت میں ایک ایرانی حکیم 'پنچ تنتر' کا پہلوی میں ترجمہ کرنے کے لیے ہندوستان آیا تھا۔ اس کا فارسی ترجمہ 'انوارِ سہیلی' کے نام سے مشہور ہے۔ اس سلسلے میں جناب عابد علی عابد نے اپنے محققانہ و عالمانہ مضمون ''داستانِ خرد افروز'' میں ''تاریخ عرب'' کے حوالے سے معروف مستشرق فلپ کے حتی کی درج ذیل آرا پیش کی ہیں:

عربی کی قدیم ترین ادبی تخلیق جو ہم تک پہنچی ہے، وہ کلیلہ و دمنہ ہے (حکایاتِ بیدپا)۔ یہ کتاب اصلاً سنسکرت میں تھی، پھر پہلوی میں ترجمہ کی گئی اور عربی ترجمہ اسی پر مبنی ہے۔ خسرو نوشیرواں کے عہد حکومت میں (۵۳۰ - ۵۷۸ء) جہاں ہندوستان سے شطرنج آئی وہاں اصل سنسکرت کتاب بھی آئی۔ کلیلہ دمنہ کا عربی ایڈیشن اس لیے خصوصاً اہم ہوگیا ہے کہ نہ تو پہلوی نسخہ سے ملتا ہے اور نہ اصل سنسکرت کتاب ہاتھ آتی ہے، اگرچہ پنچ تنتر میں بھی مطالب اور معانی زیادہ مفصل صورت میں پائے جاتے ہیں۔ عربی ہی سے قریباً چالیس زبانوں میں اس کتاب کا ترجمہ ہوا۔[۴]

''الف لیلہ ولیلہ'' کی تقریباً تمام کہانیوں کا انداز ڈرامائی ہے۔ مثال کے طور پر ''تین سیب کی کہانیاں''۔ اسی طرح قاری جب ان کہانیوں کو پڑھتا ہے تو اس کے چشمِ تصور میں کہانی کے مناظر رقص کرنے لگتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہر کہانی فلم اسکرین کی طرح نظروں سے گزرنے لگتی ہے۔ ان کہانیوں میں قسمت یا تقدیر کی کارفرمائی بھی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ خود شہزاد کی تقدیر یا قسمت نامعلوم محسوس ہوتی ہے لیکن انجام بھی تقدیر کی امید پر قائم ہے۔

''الف لیلہ ولیلہ'' کی کہانیوں میں ایک تکنیک یہ بھی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے کہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی پیشگی اطلاع دی جاتی ہے جس سے تجسس برقرار رہتا ہے۔ اسی طرح کہانیوں میں ''مقصدی تکرار'' کی تکنیک بھی استعمال کی گئی ہے۔ ساتھ ہی غیر متوقع سوال قائم کرکے اگلی کہانی کی پیش بندی کی جاتی ہے۔

'الف لیلہ ولیلہ' کے موضوعات

بعض کہانیوں میں جرائم کے عناصر بے حد نمایاں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جستجو، تفتیش اور سسپنس بھی پائے جاتے ہیں۔ جدید ادب میں ایسا لگتا ہے کہ سراغ رسانی یا 'جاسوسی ادب' کی بنا بھی 'الف لیلہ ولیلہ' کے مرہون منت ہے۔ ان کہانیوں میں کرائم فکشن کے عناصر بکھرے ہوئے ہیں۔ قتل، سنسنی خیزی، انکشاف، قتل کی منصوبہ بندی، سسپنس، ایڈونچر وغیرہ۔ گویا جاسوسی ادب کے تمام عناصر موجود ہیں۔ دیکھیے عورت کے قتل کی کہانی، خلیفہ ہارون رشید کا اپنے وزیر جعفر کو قتل کی تفتیش (Investigation) کے لیے تین دنوں کی مہلت دینا۔ اسی طرح Horror Fiction کے عناصر بھی اس میں موجود ہیں۔ دیکھیے یہودی ڈاکٹر کی کہانی، کبرا کے مرنے کا دلچسپ انکشاف، تین سیب کی کہانیاں وغیرہ۔

''الف لیلہ ولیلہ'' کے موضوعات میں جنسی طنز و مزاح، خوف ناک کہانیاں اور سائنس فکشن واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ میں لکھی جانے والی جدید کہانیوں اور ناول نگاری پر اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ ان میں خوفناک کہانیاں، ایڈونچر، سراغ رسانی پر مبنی فکشن، فنتاسی، سائنس فکشن، حتیٰ کہ جدید سائنسی تجربات پر بھی الف لیلہ ولیلہ کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ جدید خوف ناک کہانیوں پر اس کے اثرات جاننے کے لیے H. P. Lovecraft کے ناول دیکھیے۔

''الف لیلہ ولیلہ'' کے موضوعات میں پچھلی قوموں کی ترقی یافتہ تہذیب سے نہ صرف شناسائی ہوتی ہے بلکہ عبرت کے نشانات

بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں ترقی یافتہ قوموں کا عروج بھی نظر آتا ہے اور ان کے زوال کا مشاہدہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ ان کہانیوں میں مستقبل کی یافت بھی ہے اور انسانی فطرت کی کجروی اور نفسانی کمزوریاں بھی محسوس کی جاسکتی ہیں۔

فلم اور موسیقی میں 'الف لیلہ ولیلہ'

فلم اور موسیقی کی دنیا میں 'الف لیلہ ولیلہ' کو ۲۰ویں صدی کے قبل سے ہی استعمال کیا جارہا ہے جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ فرانس میں ۱۹۰۵ میں سب سے پہلے فلم بنائی گئی۔ اسی طرح *Thief of Baghdad* پر تین فلمیں ۱۹۲۴، ۱۹۴۰ اور ۱۹۷۴ میں بنائی گئیں۔ امریکن اینی میشن اسٹوڈیو نے *1001 Arabian Nights* کے عنوان سے کارٹون کے کردار مسٹر ماگو (Mr. Magoo) پر فلم تیار کی۔ ۱۹۶۹ء میں جاپان میں اینی میٹڈ فلمیں (Animated Movies) تیار کی گئیں جن میں 'الف لیلہ ولیلہ' کی کہانیوں کے پرکشش جنسی میلان رکھنے والے حصوں کو نوجوانوں کے لیے تیار کیا گیا جن کے ہدایت کار (Director)، Osamn Tezuka اور Eichii Yamamoto تھے۔ ۱۹۹۲ میں Disney نے Aladdin کے نام سے Animated Movie بنائی جس میں روبن ولیمز نے 'جن' کی آواز دی تھی۔ ۲۰۰۰ء میں BBC (لندن) نے بھی دو حصوں میں ایک ٹی وی منی سیریز ٹیلی کاسٹ کی۔ اسی طرح Sir Richard Francis Burton کے ترجمے کی بنیاد پر Steve Barron کی ہدایت کاری میں فلمیں بنائی گئیں۔ واضح ہو کہ ۲۰۱۲ میں 1001 Nights کو بچوں کے لیے بطور سیریئل تیار کیا گیا۔ یہ سیریئل (Serial)، Teletoon کے ذریعے لانچ کیا گیا جسے دنیا کے ۸۰ ممالک میں بشمول Discovery Kids دکھایا گیا۔

ہندوستان میں ساگر انٹرٹینمنٹ لمیٹڈ کے ذریعے ۱۹۹۷ سے ۲۰۰۰ء کے دوران میں ایک ٹی وی سیریئل اصل عنوان *A lif Laila* کے بجائے *Alif Laila* کے نام سے بنایا گیا۔ اس سیریئل کا آغاز شہرزاد سے ہوتا ہے جو بادشاہ شہریار کے سامنے کہانیاں کہتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

اسی طرح موسیقی کی دنیا میں ۲۰۱۳ میں Abney Park نے شہرزاد کے نام سے موسیقی البم جاری کیا۔ ویڈیو گیم کو بھی الف لیلہ سے الگ نہیں رکھا گیا۔ آرٹ یا فن کی دنیا میں 'الف لیلہ ولیلہ' کے کرداروں کو پینٹ (Paint) کرنے کا رجحان بھی پیدا ہوا۔ یہ سلسلہ ۱۷۸۵ سے جاری ہے اور اب تک درجنوں فرضی تصاویر بنائی جاچکی ہیں۔ اس فن کا مظاہرہ دنیا کے معروف آرٹسٹوں نے کیا ہے۔ چند تصاویر انٹرنیٹ پر بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

کہانیوں میں ادبی وعلمی پہلو

ان کہانیوں کا ادبی پہلو بھی نمایاں ہے۔ ان میں مختلف مواقع پر اشعار کا برمحل استعمال، ادبی تہذیب وتمدن کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان اشعار کے ذریعے مشورے بھی دیے جاتے ہیں، آئندہ اقدام کے لیے انتباہ بھی ہے اور مسائل کے حل بھی تجویز کیے جاتے ہیں۔ بعض اشعار میں اللہ رب العزت کی حمد اور اس کی قوتِ قاہرہ کا احساس ہوتا ہے۔ اشعار کے ذریعہ سوالات قائم کیے جاتے ہیں

اور چیلنجز کو قبول کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ غلط فیصلے پر افسوس کا اظہار اور قسمت کے آگے گھٹنے ٹیک دینے کا عندیہ ملتا ہے۔ اشعار کے ذریعے زندگی کے مسائل اور پیچیدہ حالات پر تنقید بھی کی جاتی ہے۔ زندگی کے جملہ مسائل میں خالقِ کائنات اللہ رب العزت کی طرف رجوع کرنے اور توبہ کی توفیق مانگنے کے ساتھ اشعار کے ذریعے انسانی جذبات واحساسات اور انسانی دانش مندی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ خوشی اور غم یا حیرت واستعجاب کے موقع پر اشعار کے برمحل استعمال سے کہانی کی رنگ آمیزی میں تہذیب وتمدن کی نمایاں جھلک دکھائی دیتی ہے۔

''الف لیلہ ولیلہ'' کے موضوعات میں ماضی کے حقیقی واقعات اور حکایات کی جھلک اور بعض دانش مندوں کے حکیمانہ فیصلے اور اقوال بھی ملتے ہیں۔ ایک کردار نزہت الزماں کے قصے میں عقل ودانش اور حکمت وعلم کی باتیں نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہیں۔ ان کہانیوں میں اشعار کا برمحل استعمال محض چٹخارے کے طور پر نہیں ہوا ہے بلکہ ان اشعار سے کردار میں حکمت ودانش مندی کا پتا چلتا ہے اور سامنے والے کے لیے ان اشعار میں واضح پیغام ملتا ہے۔ بطور مثال چند اشعار کا مفہوم ملاحظہ کیجیے:

۱۔ ''جب تو تنگی میں مبتلا ہو تو بڑے لوگوں کی طرح صبر کا جامہ پہن، یہی دانش مندی ہے۔''
''خدا کی شکایت بندوں سے مت کر، کیوں کہ ایسا کرنے سے تو رحیم کی شکایت غیر رحیم سے کرتا ہے۔''

۲۔ ''میں نے اپنی روزی کے لیے ہاتھ بڑھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ روزی ہاتھ سے نکل گئی۔ کتنے جاہل ہیں جو ثریا تک پہنچ گئے ہیں اور کتنے عالم خاک میں چھپے پڑے ہیں۔''

۳۔ ''اگر کسی کی زندگی صبح کو صاف ستھری ہے تو رات ہوتے ہوتے زمانہ اس کو ہلاکت کا جام پلا دیتا ہے۔''
''واقعی میری حالت پہلے ایسی تھی کہ اگر پوچھا جاتا کہ سب سے زیادہ عیش وآرام میں کون ہے تو جواب ملتا کہ میں۔''

۴۔ ''تیرے رخسار کا تل ایسا ہے جیسا کہ یاقوت پر مشک کا نقطہ۔ اے میرے دل کے نقطے اور اس کی خوراک! مجھے اپنے وصال سے خوش کر اور سخت دل مت ہو۔''

۵۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ تو اپنے علم وفضل کی وجہ سے دنیا میں اتنا ممتاز ہے جتنی کہ چاندنی رات۔''
''تو مَیں ان کو جواب دیتا ہوں کہ چلو باتیں نہ بناؤ کیوں کہ اگر قسمت یاوری نہ کرے تو علم ہیچ ہے۔''

۶۔ ''اگر زمانہ تیرے ساتھ بخشش کرے تو، تو بھی لوگوں کو دل کھول کر دے قبل اس کے کہ زمانہ اپنا ہاتھ کھینچ لے کیوں کہ جب امیری آتی ہے تو بخشش سے وہ فنا نہیں ہوتی اور جب وہ جانے لگتی ہے تو کنجوسی سے وہ رک نہیں جاتی۔''

۷۔ ''اے ہم مسکین عاشقوں کے مددگار، محبت اور آرزوؤں کی آگ ہم کو جلا رہی ہے۔ اگر تم ہماری مدد کرو تو ہم اس کے مستحق ہیں۔ ہم نے تمھارے یہاں آکر پناہ لی ہے لہٰذا ہمیں برا مت کہو۔ ہم ذلیل اور غریب ہیں اس لیے تمھارا جو جی آئے ہمارے ساتھ کرو۔ اگر تم ہمیں اپنے گھر میں قتل کر ڈالو تو یہ تمھارے لیے فخر کا باعث نہ ہوگا مگر ہمیں ڈر ہے تو یہ کہ کہیں تم گناہ میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔''

۸۔ ''اے فراق کے طالب ذرا ٹھہر جا اور ہم کنار ہونے پر گھمنڈ مت کر۔''

''ذرا صبر کر کیوں کہ زمانے کی عادت دھوکہ بازی اور وصال کے بعد فراق ہے۔''

۹۔ ''اے عاشقو، خدا کے لیے یہ تو کہو کہ جب انسان کا عشق بہت زور پکڑے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟''

''اسے چاہیے کہ اپنے عشق کو روک تھام کر رکھے اور اپنا بھید ظاہر نہ ہونے دے اور جو کچھ اس پر گزرے، اس پر صبر کرے اور فروتنی اختیار کرے۔''

اسی طرح ''الف لیلہ ولیلہ'' کی کہانیوں میں علم وحکمت اور دانش مندی کی باتیں بکھری ہوئی ہیں۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایسی باتیں ان کرداروں کی زبان سے بیان کی گئی ہیں جن کا تعلق عام طور سے معاشرے کے محروم ومظلوم طبقے سے ہے۔ ان میں کنیزوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ دانش مندی کے چند اقوال بطور مثال درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ ''جو شخص اپنی ہوا و ہوس کی اطاعت کرتا ہے، وہ اپنے حقوق ضائع کر دیتا ہے اور جو چغل خور کی باتیں سنتا ہے، اپنے دوست کو کھو بیٹھتا ہے۔''

۲۔ ''جو شخص ظلم کرنے سے نہیں ڈرتا، وہ تلوار سے نہیں بچتا۔''

۳۔ ''دوست عورت کی طرح نہیں ہوتا کہ آج طلاق دی اور کل پھر شادی کر لی۔ بلکہ اس کا دل شیشے کی طرح ہوتا ہے، جب ٹوٹ گیا تو پھر نہیں جڑ سکتا۔''

۴۔ ''کوئی فیصلہ سچائی کے لیے سودمند نہیں ہوتا جب تک چھان بین کر کے نہ کیا جائے۔ قاضی کو چاہیے کہ تمام لوگوں کو ایک درجے پر رکھے تاکہ بڑے آدمی کو ظلم کرنے کی ہمت نہ ہو اور کمزور کو انصاف سے ناامیدی نہ ہو۔''

۵۔ ''اے بادشاہ، سن! زمانے کا دار و مدار بادشاہ کے نیک چال چلن پر ہے کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انسان میں دو چیزیں ہیں، اگر وہ ٹھیک ہیں تو لوگ ٹھیک ہوجاتے ہیں اور اگر وہ بگڑ جائیں تو لوگ بگڑ جاتے ہیں: علما اور امرا۔''

۶۔ ''تین چیزیں ایسی ہیں کہ بغیر تین وقتوں کے وہ معلوم نہیں ہوسکتیں۔ حکیم غصے کے وقت، بہادر لڑائی کے وقت، دوست ضرورت کے وقت۔''

یہ بات حیران کرتی ہے کہ اس کی بعض کہانیوں میں قرآن مجید و اقوالِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ اسی طرح خلفائے راشدین، صحابہ کرام، اموی اور عباسی دور کے ائمہ و بزرگوں کی حکیمانہ باتیں، اپنے زمانے کے دیگر عصری علوم کے علاوہ فقہا سے مروی اسرارِ دین کی باتیں وغیرہ۔ ان تمام امور کے ساتھ کہانیوں کا انداز انتہائی معروضی اور تکلف سے عاری ہے۔ چار سو اڑتیس ویں رات سے چار سو اِکسٹھ ویں رات کی داستان میں خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں ایک کمسن کنیز کا اپنے زمانے کے ماہرین علما، دانشوروں سے مناظرہ انتہائی دلچسپ ہے۔ کنیز نے مختلف علوم کے تمام علما و دانشوروں کے مختلف النوع سوالات کے درست جوابات دیے اور انھیں دربار میں اپنے دعویٰ کے زعم کا مزہ چکھنا پڑا۔

''الف لیلہ ولیلہ'' سے متعلق اردو کے معروف ادیب و افسانہ نگار انتظار حسین کا تجزیہ عرب مسلمانوں پر مرتکز ہے۔ وہ ان کہانیوں کو اسلام سے قبل اور اسلام کے بعد کے حالات و واقعات کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ الف لیلہ پر گفتگو کرتے

ہوئے ان کے لہجہ میں طنز محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انتظار حسین الف لیلہ ولیلہ کو عربوں کی تخلیق تصور کرتے ہیں۔ درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''الف لیلہ عربوں کے تخیل کا کارنامہ ہے جو قبائلی زندگی کی منزل عبور کرچکے تھے مگر جن کے سینے میں ابھی قبائلی الاؤ کی آنچ باقی تھی۔ ابھی زیادہ زمانہ نہیں ہوا کہ عرب شاعر میلوں میں پہنچتے اور ٹیلوں پر کھڑے ہوکر اپنا کلام سناتے اور داستان گویوں کی یہ کیفیت تھی کہ راتوں کے صحرائی سفر میں قافلے نے جہاں پڑاؤ کیا اور الاؤ گرم کیا، انھوں نے کوئی داستان شروع کردی۔ اب سلطنتِ عباسیہ کا زمانہ تھا۔'' (نوٹ: اگرچہ کہانیوں کے قلم بند ہونے کا زمانہ دورِ عباسیہ کے بعد کا زمانہ بتایا جاتا ہے۔ انتظار حسین)

اسی مضمون میں انتظار حسین آگے لکھتے ہیں:

> ... لیکن اب قرآن نے انھیں یہ راز بتادیا تھا کہ فطرت کی ساری طاقتیں ان کے لیے مسخر ہیں۔ وہ اپنے صحرا سے نکلتے ہیں اور دنیا کے سمندروں، صحراؤں اور جنگلوں کو کھوندتے پھرتے ہیں۔ بے آباد جزیرے اور خلقت سے بھرے ہوئے شہر میں سب پر وہ چھاتے چلے جاتے ہیں۔ وہ پورے کرہ ارض پر پھیل جانا چاہتے ہیں۔ بڑھنے اور پھیلنے کا یہ جذبہ الف لیلہ کا بنیادی جذبہ ہے۔ الف لیلہ کی کہانیوں میں ایکشن اکثر سفر سے پیدا ہوتا ہے۔ سفر کا انجام کہانی کا بھی انجام ہوتا ہے۔ سفر ان کرداروں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ سفر وسیلہ ظفر ہے، یہ خیال ان کے ایمان کا حصہ بن چکا ہے۔[۵]
>
> (بحوالہ علامتوں کا زوال، صفحہ ۱۴۲)

انتظار حسین کی درج ذیل باتیں بھی قابلِ توجہ ہیں:

> ... الف لیلہ ہماری اجتماعی ذات کی دستاویز ہے۔ کون کون سے اندیشے اور وسوسے ہمارے اندر چھپے ہوئے ہیں، کن کن رویوں میں آکر انھوں نے ہماری فکر کو اور ہمارے طرزِ عمل کو متاثر کیا ہے، کس طرح ہم ان سے ڈرے اور لڑے ہیں اور کیا کچھ ہارے جیتے ہیں، الف لیلہ کے ذریعے اگر ہم یہ سمجھ لیں تو پھر شاید آج جو کچھ ہم ہیں اور کل جو کچھ ہوسکتے ہیں اسے بھی سمجھ سکیں۔
>
> (علامتوں کا زوال، صفحہ ۱۴۸)

اردو میں 'الف لیلہ ولیلہ' کی ترجمہ نگاری

پروفیسر حنیف نقوی نے اپنے تحقیقی مقالہ ''شبستانِ سرور کا ماخذ'' میں اس موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> ''اردو میں ترجمہ نگاری کا کام ایک منظم اور باضابطہ تحریک کے طور پر ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد شروع ہوا۔ دوسری زبانوں کی جو اہم کتابیں اس کالج کے زیرِ نگرانی ترجمے کے

لیے منتخب کی گئی تھیں، ان میں 'الف لیلہ' بھی شامل تھی۔ عتیق صدیقی کی تحقیق کے مطابق ۱۸۰۳ء میں تین سوصفحات پر مشتمل اس کا ایک ترجمہ جو شاکر علی نامی کسی شخص نے کیا تھا، طباعت کے لیے تیار تھا لیکن اسے پریس تک پہنچنا نصیب ہوا یا نہیں، اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔۶۔ شاکر علی کے اس معدوم ترجمے کے بعد اس سلسلے کی دوسری کوشش کے طور پر مدراس کے شمس الدین احمد کی 'حکایات الجلیلہ' کا نام لیا جاسکتا ہے جو دو جلدوں میں منقسم تھی اور ہر جلد میں سو راتوں کا بیان تھا۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۳۶ء میں اور دوسری جلد ۱۸۳۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس ترجمے کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ 'الف لیلہ' کے اصل عربی متن پر مبنی تھا۔ اس کے بعد انیسویں صدی میں مختلف حضرات کے کیے ہوئے جو ترجمے اشاعت کی منزل سے گزر کر منظرِ عام پر آئے، ان میں سے مندرجہ ذیل تراجم بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔[6]

(۱) الف لیلہ از عبدالکریم: یہ چار حصوں میں منقسم ہے، لیکن چاروں حصے سلسلہ وار ایک ہی جلد میں شائع ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق عبدالکریم کا یہ ترجمہ فارسٹر کے انگریزی ترجمے سے ماخوذ ہے اور فارسٹر نے اپنے ترجمے کی بنیاد گالاں کے فرانسیسی ترجمے پر رکھی ہے۔ عبدالکریم نے اسے ۱۸۴۲ء مطابق ۱۲۵۸ھ میں مکمل کیا اور پانچ برس بعد ۱۸۴۷ء مطابق ۱۲۶۳ھ میں پہلی بار اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ بعد ازاں ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء اور ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں مطبع مصطفائی، کانپور سے اس کے کم از کم دو ایڈیشن اور شائع ہوئے۔ فی الوقت یہی دونوں ایڈیشن ہمارے پیشِ نظر ہیں۔

(۲) شبستانِ سرور از مرزا رجب علی بیگ سرور: 'شبستانِ سرور' تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۷۹ھ برآمد ہوتا ہے، یہی اس ترجمے کا سالِ تکمیل ہے۔ عبدالکریم کی 'الف لیلہ' کی طرح یہ ترجمہ بھی چار حصوں پر مشتمل ہے اور یہ چاروں حصے ایک ہی مجلد کی صورت میں اپنی تکمیل کے چوبیس برس بعد ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں پہلی اور آخری بار مطبع نجم العلوم، کارنامہ، واقع لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ سرور کا بیان ہے کہ انھوں نے یہ ترجمہ براہ راست عربی سے کیا ہے لیکن انھوں نے اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ ڈاکٹر جین نے لکھا ہے کہ خفیف اختلاف کے سوا شبستانِ سرور میں وہی حکایات ہیں جو عبدالکریم کی الف لیلہ میں ہیں۔

(۳) ہزار داستان از منشی طوطا رام شایاں: یہ ترجمہ ۱۸۶۸ء مطابق ۱۲۸۴ھ میں منشی نول کشور پریس، لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ دونوں سابق الذکر ترجموں کی طرح یہ بھی چار حصوں میں منقسم ہے۔ اس کے پہلے تین حصوں میں سے ہر حصے میں ڈھائی ڈھائی سو راتوں کا اور چوتھے حصے

میں دوسو اکیاون راتوں کا بیان ہے۔ ڈاکٹر جین کے مطابق 'اس میں عبدالکریم اور گالاں والی کہانیاں ہیں' (نیز) اس کی زبان مرصع اور مسجع ہے۔

(۴) الف لیلہ نومنظوم: یہ 'الف لیلہ' کا پہلا اور غالباً واحد منظوم اردو ترجمہ ہے۔ نام میں لفظ 'نو' کا اضافہ غیر ضروری بلکہ خلافِ واقعہ اضافہ حسابِ جمل کے تقاضوں پر مبنی ہے، جس کے نتیجے میں اس کے اعداد کا مجموعہ ۱۲۷۸ (بارہ سو اٹھتر) ہوجاتا ہے۔ یہ اس ترجمے کا سالِ آغاز ہے، تکمیل ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں ہوئی اور اشاعت اس کے ایک سال بعد ۱۸۶۹ء میں مطبع نول کشور، لکھنؤ سے عمل میں آئی۔ ڈھائی ڈھائی سو راتوں کے بیان پر مشتمل اس کے چار حصوں میں پہلا حصہ مرزا اصغر علی نسیم دہلوی نے، درمیانی دو حصے منشی طوطا رام شایاں نے اور چوتھا حصہ شادی لال چمن نے نظم کیا ہے۔ جین صاحب کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق 'اس میں عبدالکریم والی سب کہانیاں (شامل ہیں) اور دو کہانیاں مزید ہیں'۔(۷)

پیش کردہ تفصیلات کے مطابق عبدالکریم کا ترجمہ فارسٹر کے انگریزی ترجمے کے واسطے گالاں کے فرانسیسی ترجمے کا نقش ثانی ہے، جبکہ 'ہزار داستان' اور 'الف لیلہ سفر منظوم' کے مترجمین نے عبدالکریم کے واسطے سے گالاں کا تتبع کیا ہے۔'' (تحقیق و تعارف، صفحہ ۱۰۴ تا ۱۰۶)

'الف لیلہ ولیلہ' کے کردار

بنیادی طور پر 'الف لیلہ ولیلہ' کے دو کردار ہیں: شہریار اور شہرزاد۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ دونوں اپنی متضاد جنس اور فطرت کے اعتبار سے نمائندہ کردار ہیں۔ شہریار ایک بادشاہ ہے جو عورت کی بے وفائی کا مارا ہوا ہے۔ کبھی وہ مظلوم نظر آتا ہے اور کبھی ظالم۔ وہ مدبر اور دانش مند بھی ہے لیکن مایوسی اور جذباتیت کے سبب اس کی دانش مندی رخصت ہوجاتی ہے۔ وہ ہر رات ایک نکاح کرتا ہے اور صبح ہوتے ہی اسے قتل کردیتا ہے۔ بالآخر اس ڈرامے میں شہرزاد نمودار ہوتی ہے جو بادشاہ شہریار کے وزیر کی بیٹی ہے۔

''الف لیلہ ولیلہ'' میں بے شمار کردار ہیں جن کو عام طور سے دو طبقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے طبقے میں بادشاہ، وزیر، شہزادے، شہزادیاں، قاضی اور امیر کبیر سوداگر وغیرہ شامل ہیں۔ دوسرے طبقے میں کنیزیں، حجام، درزی، رفوگر، تیلی، تنبولی، موچی، نائی، حمال، مچھیرے، لکڑہارے، ملاح، نابائی قسم کے لوگ ہیں۔ انتظار حسین نے دونوں طبقوں کو دو برادریاں قرار دیا ہے۔ ان کے بقول الف لیلہ میں قدآور کردار نہیں ملتے۔ یہ مختلف کردار اعلیٰ انسانی صفات رکھتے ہیں، مافوق الفطری طاقتوں سے بھی انھیں کمک حاصل ہوجاتی ہے۔ لیکن وہ اتنے قدآور نہیں بنتے کہ پوری الف لیلہ پر چھاجائیں۔ انتظار حسین کے نزدیک اموی اور عباسی سلطنتوں کے عبرت ناک انقلابات الف لیلہ کی کہانیوں، آوارہ و بے خانماں وزیرزادوں اور شہزادوں کی آپ بیتیوں میں جابجا جھلک دکھاتے ہیں۔ انتظار حسین یہ بھی لکھتے ہیں کہ الف لیلہ میں مثالی ہیرو کے تصور کی نفی ملتی ہے۔ اس کی کہانیوں کے ہیرو محض خوبیوں کا مجموعہ نہیں ہیں۔

ان میں بہت سی اچھائیاں ہیں جن کے زور پر وہ ترقی کرتے ہیں مگر پھر انسان ہیں۔ ان میں کمزوریاں بھی تو ہیں۔ اس لیے کسی منزل پر فوق الانسان یا دیوتا نہیں بنتے۔ (علامتوں کا زوال، صفحہ ۱۴۶)

انتظار حسین نے الف لیلہ کے حوالے سے مغربی مصنفین کے بارے میں ایک عجیب سی بات کہی ہے۔ ذیل کے اقتباسات میں خط کشیدہ الفاظ خاص طور سے ملاحظہ فرمائیں۔ وہ الف لیلہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> انسانی فطرت کے اس مطالعے میں نہ تو جذبات وتعصبات کو دخل ہے نہ کوئی اخلاقی معیار راہ میں حائل ہے۔ الف لیلہ کے مصنفوں نے وعظ و پند کا فرض اپنے ذمہ نہیں لیا ہے، وہ کسی منبر پر نہیں کھڑے ہیں، کسی اونچے مقام سے نہیں بولتے، اپنی طرف سے کوئی رائے زنی نہیں کرتے۔ بھول چوک کی اس پوٹ کو جیسا انھوں نے جانا ہے پیش کر دیا ہے۔ آدمی کو یوں معروضی طور پر دیکھنے اور سمجھنے کا رویہ بیسویں صدی کے مغربی فکشن کا مخصوص وصف ہے اور ممکن ہے کہ اس واقعے کے پیش نظر یہ کہا جائے کہ جدید نفسیات نے جب آدمی کو اس طرح سمجھنے کا طریقہ سکھا ہی دیا ہے اور مغرب کے ناول نگار اسے تخلیقی طور پر برت بھی چکے ہیں تو الف لیلہ ہی سے کیوں رجوع کیا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انسانی فطرت سے آگاہی کوئی خالی علمی معاملہ نہیں ہے اور نہ کسی نسخے سے وہ فوراً آ کے فوراً حاصل ہوتی ہے۔

پھر اپنے مضمون کے آخر سے ذرا قبل لکھتے ہیں:

> لیکن ہمارے لیے الف لیلہ نہ تو گمشدہ مال ہے نہ پرایا مال ہے۔ اس کی یہ حیثیت تو یوروپ والوں کے لیے ہے۔ مسلمانوں کی جس تصنیف کا حلقہ اثر سب سے زیادہ وسیع ہے اور مختلف ملکوں میں پھیلا ہوا ہے، وہ یہی کتاب ہے۔ اکیلی انگریزی میں اس کے بہت سے ترجمے اور انتخاب دستیاب ہو جائیں گے۔ مگر ان کے لیے یہ مشرق کے اجنبی تخیل کا اجنبی کارنامہ ہے۔ وہ فاصلے پر کھڑے ہو کر ان کہانیوں کو پڑھتے اور پسند کرتے ہیں۔[۸] (علامتوں کا زوال، صفحہ ۱۴۸ تا ۱۵۰)

''الف لیلہ ولیلہ'' کے دو بنیادی کرداروں شہر یار اور شہرزاد کا جائزہ لیتے ہوئے چند سوالات ذہن میں قائم ہوتے ہیں:

پہلا کردار: بادشاہ شہر یار

۱۔ کیا عورت کی بے وفائی نے اسے ذہنی مریض بنا دیا ہے؟

۲۔ کیا عورت ذات سے اس کا اعتماد اٹھ چکا ہے؟

۳۔ کیا وہ ہر رات عورت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا؟

۴۔ کیا وہ صنفِ نازک سے انتقام لے رہا ہے؟

۵۔کیا وہ اپنے ذہنی ونفسیاتی مرض سے کبھی نکل سکے گا؟

دوسرا کردار: وزیر زادی شہرزاد

عورت کی آزادی کے موجودہ عہد بالخصوص آج کے نسائی ادب میں شہرزاد کے کردار کی معنویت پر از سرنو غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔شہرزاد ایک دانا اور ذہین وفطین عورت ہے۔ وہ ہر رات اپنی کہانیوں کے ذریعے انسانی فطرت اور نفسیات سے پردہ اٹھاتی ہے۔اس کا انداز معروضی ہے اور وہ کسی تکلف سے کام نہیں لیتی۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کردار نسائی ادب کا شاہ کار ہے۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ فکشن نگار خواتین سے بہت قبل 'شہرزاد کا تخلیقی کردار' ادب میں وجود آ چکا تھا۔ ہر رات اس کی پیش کردہ کہانیوں میں انسان سے متعلق بڑے اہم سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ مثلاً:

۱۔انسان کیا ہے اور اس کی اصل کیا ہے؟

۲۔انسان کی فطرت کیا ہے اور پل پل اس کے مزاج میں تغیر کیوں ہوتا ہے؟

۳۔انسان کے اندر شر اور خیر کی کش مکش کے کتنے روپ ہیں؟

۴۔انسان کا باطن کیا اور اس کے اظہار کی کتنی سطحیں ہیں؟

۵۔اور یہ سوال بھی اہم ہے کہ کیا شہرزاد کے کردار نے مستقبل میں آزادیِ نسواں یا نسائی ادب کو بنیاد فراہم کی ہے؟ کیا اسی کردار سے متاثر ہو کر خواتین تخلیق کاروں کا جنم ہوا؟

ان سوالات کی روشنی میں اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کے اندر کا 'خیر' اسے اگر بلندی پر فائز کر دیتا ہے تو دوسری طرف اس کے اندر کا 'شر' اسے انتہا درجے کی پستی میں بھی گرا دیتا ہے۔ انسان کے باطن میں جو جنسی خواہش موجود ہے، خواہ عورت ہو یا مرد، اس کے اظہار کی جہتیں پرت در پرت کھلتی ہیں۔

جس زمانے میں الف لیلہ ولیلہ کی باضابطہ تصنیف و تالیف ہوئی اس وقت کے حالات اور مہذب دنیا میں سماج کا جو تہذیبی و ثقافتی ماحول تھا، اس میں عورت کا مقام سیپ میں بند موتی کی مانند تھا۔ یورپ اور امریکا میں بھی کچھ حد بندیاں قائم تھیں۔ ایسے ہی ماحول میں اس کا پہلا فرانسیسی ترجمہ آں تونے گالاں (Antoine Galland) نے کیا۔غور و فکر کا مقام یہ ہے کہ اس وقت یورپ نے ان کہانیوں کو کس نظر سے دیکھا؟ ممکن ہے کہ ان کہانیوں میں اسلامی تہذیب کا عکس بھی نظر آیا ہو لیکن ان کہانیوں میں متضاد انسانی رویوں کے سبب ان کے دیکھنے کے زاویے میں انقلابی تبدیلیاں بھی آئی ہوں گی۔ مثال کے طور پر بادشاہوں کے عدل و انصاف کے ساتھ ان کی عیش پسندی۔ شراب نوشی۔ قابل غور امر یہ بھی ہے کہ اس وقت کنیزوں کی خرید و فروخت اور ان سے لذت کا حصول، کنیزوں کی خوب صورتی، حاضر جوابی اور علمی صلاحیتیں تو دیکھی جاتی تھیں لیکن حسب و نسب دریافت نہیں کیا جاتا تھا۔ کئی کنیزوں کے بطن سے بادشاہ اور ولی صفت انسان پیدا ہوئے۔

ایک اہم سوال یہ بھی ذہن میں ابھرتا ہے کہ کیا ''الف لیلہ ولیلہ'' عورت کی ذلت و رسوائی کی کہانی ہے؟ لیکن اس سوال کا

جواب خود ان کہانیوں میں موجود ہے۔ شہرزاد ہی نہیں بلکہ درجنوں عورتوں کے احوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت دانا بھی ہوتی ہے اور بصیرت بھی رکھتی ہے۔ وہ علم و حکمت سے متصف بھی ہوتی ہے اور بے بصیرتی کے نتیجے میں ذلت و رسوائی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ''الف لیلہ ولیلہ'' کی کہانیوں میں جہاں عورت کو مشقِ ستم بنایا جاتا ہے، اس سے محض ہوس کی تکمیل کی جاتی ہے تو دوسری طرف عورت کی دانائی، حکمت و تدبیر اور علم ادب کی روشن مثالیں بھی اس میں موجود ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ الف لیلہ ولیلہ کی کہانیوں میں معروف معنی میں کرداروں کے طبقے یا برادری کا وجود نہیں ہے۔ ان کہانیوں میں بشمول حکمراں طبقے کے دیگر مختلف قسم کے کردار انسانی پیشے سے تعلق رکھتے ہیں نہ کہ ذات سے۔ مجموعی طور پر ان کرداروں میں ملاح، حجام، لکڑہارا، تاجر، درزی، رفوگر، نانبائی، فقیر، مزدور، سیاح، جادوگر، چڑیلیں، جن، بادشاہ، ملکہ، وزیر، مصاحب، قاضی، شہزادے، شہزادیاں، کنیزیں، غلام، خواجہ سرا، بزرگ، عیسائی پادری، یہودی ڈاکٹر، کبرا اور طرح طرح کے جانور و پرندے بھی شامل ہیں۔ یہ سوال اہم ہے کہ ان کرداروں کا تعلق آیا اسی دنیا سے ہے یا تخیل سے ماورا دنیا سے۔ تاہم ان کرداروں میں کوئی چھوٹا یا بڑا نہیں ہے۔ ان میں رنگ و نسل کے اعتبار سے کوئی دوری یا تکلف نہیں ہے۔ ہر کردار دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے اور ایک دوسرے کی آپ بیتی سنتا ہے۔ ان میں دانش مندی اور علم و حکمت کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس میں بیشتر کردار چوں کہ انسان ہیں اس لیے ان کی کمزوریاں اور خوبیاں ان کے ساتھ لگی ہیں۔ ان کرداروں میں شراب و شباب کی محفلیں بھی آراستہ ہوتی ہیں۔ بادشاہ فقیر اور کبھی فقیر بادشاہ بھی بن جاتا ہے۔ ان میں فطرت کے تمام مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انسان کی سرشت میں چوں کہ جستجو اور کچھ پانے کی خواہش ہمہ دَم موجود رہتی ہے، اس کا تخلیقی ذہن عجائبات کا متلاشی ہوتا ہے اس لیے ''الف لیلہ ولیلہ'' ایسی ہی پراسرار اور پروازِ تخیل سے ماورا سرزمینوں میں اپنے قارئین کو لے جاتی ہے جو انسان کے وسیع اور بیکراں تخیلات میں ازل سے آباد ہیں۔ ''الف لیلہ ولیلہ'' کی کہانیوں کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ اس میں توہم پرستی نہیں ہے۔ ان کہانیوں میں اپنے زمانے کے مطابق ایسے سائنسی انکشافات ملتے ہیں جنھیں آج دنیا طلسم، جادو اور اس کے کرداروں جن و پریوں کے حوالے سے جانتی ہے۔ ایک سوال یہ ہے کہ کیا آج سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی کو دیکھ کر یہ گمان نہیں ہوتا کہ کہیں یہ جادو تو نہیں؟ آج ہم کورڈلیس موبائل میں ہزاروں میل دور کی آواز سنتے ہیں اور اپنی آواز پہنچاتے بھی ہیں۔ کمپیوٹر ٹکنالاجی کے ذریعے ہم ہزاروں میل دور کی تصاویر من و عن کیوں کر دیکھ لیتے ہیں؟ کمپیوٹر کے ہارڈ ڈسک میں موجود ڈاٹا ہزاروں میل دور کس طرح منتقل ہوجاتا ہے؟ اس کی سائنسی توجیہات کے باوجود ہم پر اب بھی اصل حقیقت سے پردہ نہیں اٹھا ہے۔

'الف لیلہ ولیلہ' کے کرداروں میں تصوراتی کرداروں کے علاوہ بعض تاریخی کردار بھی ملتے ہیں۔ ان میں خاص طور سے برامکہ، حجاج بن یوسف، ہارون الرشید، حاتم طائی، جعفر بن یحیٰی، خسرو دوم، ابونواس، شیریں اور زبیدہ بنت جعفر شامل ہیں۔ ان کرداروں کو شامل کر کے ایسا لگتا ہے کہ ''الف لیلہ ولیلہ'' کے نامعلوم مصنف/مصنفوں نے کہانیوں میں حقیقی رنگ آمیزی کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخی اعتبار سے بہت سی باتیں ان تاریخی کرداروں کے عادات و اطوار پر صادق بھی آتی ہیں۔

حواشی

۱۔ جواہرلعل نہرو یونی ورسٹی، نئی دہلی میں سنٹر فار عربی اینڈ افریقین اسٹڈیز کے زیرِاہتمام ۲۰۱۰ میں ''الف لیلہ ولیلہ'' یا The Arabian Nights کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سمینار منعقد ہوا تھا۔ اس سمینار میں بیشتر مقالے انگریزی میں، چند عربی اور اردو میں پیش کیے گئے تھے۔ ۲۰۱۵ میں اس سمینار کے اہم ۱۵ انگریزی مقالات کو کتابی شکل دی گئی ہے۔ اس کے مدیران ڈاکٹر رضوان الرحمٰن اور سیّد اختر حسنین ہیں۔ اس کا ''پیش لفظ'' انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کے کپلا واتسیان نے لکھا ہے۔ اس کتاب کا بارھواں مقالہ حسنین اختر کا ہے۔ ڈاکٹر سید حسنین اختر الہ آباد یونی ورسٹی کے شعبہ عربی، فارسی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ ان کے مقالے کا عنوان ہے: *Reception of Alf Layla in India with Special Reference to Urdu*۔ اس تحقیقی مقالے میں ڈاکٹر اختر نے انجمن ترقی اردو، نئی دہلی کے زیرِاہتمام (۱۹۴۰ تا ۱۹۴۶) شائع ہونے والی کتاب ''الف لیلہ ولیلہ'' (سات جلدیں) کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اردو میں 'الف لیلہ' کے پندرہ سے زائد ترجموں کا انکشاف کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ۱۸۴۴ میں جعفر علی، محمد حسن علی خان اور شاہدالدین خان کے ترجمے کی نقل (transcript) جو ۵۸۵ صفحات پر مشتمل ہے، لندن کے انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔ ڈاکٹر اختر کے بقول رجب بیگ سرور نے 'الف لیلہ' کے ترجمہ ''شبستانِ سرور'' کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ۱۸۵۶ میں جب وہ اودھ سلطنت کے زوال کے بعد بے روزگار ہوگئے تو برٹش حکومت کے ایک ملازم منشی شیونارائن نے انھیں 'الف لیلہ' کا ترجمہ کرنے کی ترغیب دی۔ ''شبستانِ سرور'' کے نام سے یہ کتاب بنارس سے ۱۸۶۳ / ۱۲۷۹ ہجری کے قریب شائع ہوئی۔ لیکن اس کتاب میں سرور نے یہ حوالہ نہیں دیا ہے کہ انھوں نے کس نسخے سے ترجمہ کیا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ عبدالکریم کے ترجمے سے استفادہ کیا گیا تھا۔ عبدالکریم نے Forster کے انگریزی متن کا اردو ترجمہ کیا تھا جو ۱۸۴۷ میں شائع ہوا۔ یہ کتاب ایک جلد میں تھی جس کے چار حصے تھے۔ ڈاکٹر اختر نے اپنے مقالہ میں مرزا حیرت دہلوی کے ترجمہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ ترجمہ 'شبستانِ حیرت' یا 'الف لیلہ شہرزاد' کے نام سے ۱۸۹۲ میں شائع ہوا۔ اس میں ایک ہزار راتوں کا ذکر ہے۔ یہ کتاب ناول کے طرز پر لکھی گئی تھی۔ اسی طرح ''الف لیلہ دنیازاد'' بھی ناول طرز پر لکھا گیا۔ دونوں کتابیں نول کشور، لکھنؤ کے زیرِاہتمام شائع ہوئی تھیں۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے بھی ۱۹۰۱ میں 'الف لیلہ' کا دو جلدوں میں ترجمہ کیا۔ اس کی اشاعت بھی نول کشور، لکھنؤ کے ذریعے ہوئی تھی۔ سرشار نے یہ ترجمہ انگریزی اور عربی متن کو ملحوظ رکھ کر کیا تھا۔ ڈاکٹر اختر کے بقول اردو کے داستانی ادب پر 'الف لیلہ' کے اثرات واضح طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ مثلاً حیدر بخش حیدری کی داستانوں کے چار مجموعے شائع ہوئے ان میں ایک ''آرائشِ محفل'' ہے جو ۱۸۰۱ میں شائع ہوا۔ یہ فارسی کہانی ''قصہ حاتم طائی'' کا اردو ورژن محسوس ہوتا ہے۔ ''باغ و بہار'' کے مصنف میر امن کا ''قصہ چہار درویش'' بھی الف لیلہ کا چربہ محسوس ہوتا ہے۔

۲۔ علامہ شبلی نعمانی (وفات ۱۹۱۴ء) نے اپنے ایک مراسلہ میں 'الف لیلہ ولیلہ' کو اصلاً فارسی سے منقول قرار دیا ہے۔ معارف (اعظم گڑھ) کے شبلی نمبر (نومبر، دسمبر ۲۰۱۴) میں ڈاکٹر الیاس الاعظمی کا ایک تحقیقی مقالہ ''مراسلاتِ شبلی ایک مطالعہ'' شائع ہوا ہے۔ علامہ شبلی کا مراسلہ مصر کے رسالہ الہلال (مدیر جرجی زیدان، دسمبر ۱۸۹۵) میں حکمت بک شریف کے ایک مراسلہ کے جواب میں شائع ہوا تھا۔ مراسلہ نگار حکمت بک شریف نے 'الف لیلہ ولیلہ' کو یونانی الاصل قرار دیا تھا اور یہ دلیل پیش کی تھی کہ اس میں قہوہ کا ذکر ہے اور قہوہ اس زمانے میں موجود نہیں تھا۔ علامہ شبلی نے اس مراسلہ کے جواب میں جو مراسلہ لکھا اس میں حکمت بک شریف کے موقف اور دلائل کی تردید کی ہے۔ انھوں نے پہلے مسعودی کی مروج الذہب اور ابن ندیم کی الفہرست کے حوالہ سے عربی تراجم کا ذکر کیا ہے اور متعدد مترجمہ کتب کی تفصیل پیش کی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ ''ان تمام تفصیلات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اصلاً فارسی سے منقول ہے اور بعض لوگوں کو جو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ یونانی الاصل ہے صحیح نہیں ہے بلکہ ظن وتخمین ہے۔ اس قصے کی جو اصل ہے وہ تو فارسی ہے۔ ہاں اس میں الحاقات بھی بہت ہوئے ہیں اور غالباً یہ الحاقات جہشیاری وغیرہ کے اس موضوع کے نسخوں سے کیے گئے ہیں۔ آپ کے مایہ ناز رسالہ 'الہلال' میں فاضل مراسلہ نگار حکمت بک شریف نے جو یہ دلیل دی ہے کہ اس میں متعدد مقامات پر قہوہ کا ذکر آیا ہے جبکہ قہوہ اس زمانے میں موجود نہیں تھا تو یہ بات صحیح نہیں ہے۔ قہوہ قدیم زمانے میں شراب کے معنی میں استعمال ہوتا تھا اور یہ مشہور بات ہے۔''

۳۔ الف لیلہ کے انگریزی تراجم اور ان کے مختلف ایڈیشنوں سے متعلق معلومات کے لیے راقم پروفیسر حنیف نقوی، ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی، پروفیسر شعبہ

انگریزی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ کے تعاون کا رہین منت ہے۔

۴۔ فلپ کے حتی نے کلیلہ و دمنہ کے تعلق سے جو آرا پیش کی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ نوشیرواں کے ایما پر پہلوی زبان میں ہوا، اس کے بعد عربی پھر عربی سے قریباً چالیس زبانوں میں اس کتاب کا ترجمہ ہوا۔ اسی طرح یہ بات بھی اجاگر ہوتی ہے کہ 'الف لیلہ ولیلہ' کی کہانیوں کی تکنیک پر کلیلہ و دمنہ کا اثر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا نامناسب نہ ہوگا کہ فارس میں 'ہزار داستان' کے نام سے معروف کہانیوں کا مجموعہ جس میں ۹۸۷ ہجری میں ابن الندیم نے اضافہ کیا، اس کے بعد جہشیاری نے، جس کا ذکر علامہ شبلی نے بھی کیا ہے، عربی، ایرانی اور یونانی کہانیوں کے مرکب سے ایک ہزار کہانیاں ترتیب دیں لیکن ۹۴۲ میں اس کے انتقال کے بعد مصری اور دیگر اسلامی فتوحات سے متاثر ہوکر مزید کہانیاں اس میں شامل کی گئیں۔ بالآخر فارسی میں لکھی گئی یہ کہانیاں سب سے پہلے عربی میں 'الف لیلہ ولیلہ' کے نام سے منظرِ عام پر آئیں جن کی اصل فارسی ہی تھی۔

۵۔ انتظار حسین کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی 'الف لیلہ ولیلہ' کو عربوں کا کارنامہ تصور کرتے ہیں۔ حالاں کہ ان کہانیوں سے عربوں کا کوئی تعلق نہیں۔ عربوں میں شاعری کا رواج تھا نہ کہ داستان گوئی کا۔ عہد اسلام اور اس کے بعد عربوں میں فلسفہ و سائنسی علوم کے حصول کا رجحان غالب ہوگیا تھا۔ معروف مورخ سید امیر علی لکھتے ہیں:

> ''عربوں نے ازور کے جزائر دریافت کیے اور قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ امریکا تک چلے گئے تھے۔ قدیم براعظموں کی حدود کے اندر تو انھوں نے ہر طرف لوگوں میں محنت کے لیے اس قدر تحریک پیدا کی کہ اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی... اس طویل عرصے میں ہونے والے بے شمار ادبا اور فضلا نے انسانی علم کی ہر شاخ کی طرف توجہ دی۔ انھوں نے قواعد زبان، ادب عالیہ، فصاحت و بلاغت، لسانیات، جغرافیہ، حدیث اور سفروں کے بارے میں لکھا۔ انھوں نے لغات اور سوانح مرتب کیے اور دنیا کو فکر انگیز کتب تاریخ اور عمدہ شاعری دی۔'' (تاریخ اسلام، صفحہ ۳۶۱)

۶۔ پروفیسر حنیف نقوی نے 'الف لیلہ' کے اردو تراجم سے متعلق بیشتر باتیں 'اردو کی نثری داستانیں' از ڈاکٹر گیان چند جین (یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۷) کے حوالے سے لکھی ہیں۔ یہ کتاب ۲۰۰۲ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL)، نئی دہلی کے زیر اہتمام چھپ چکی ہے۔ تاہم Johann Heinrich Voss کے مطابق 'الف لیلہ' کا مکمل عربی متن چار جلدوں میں ۱۸۳۹ اور ۱۸۴۲ کے درمیان کلکتہ میں شائع ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ چار جلدوں پر مشتمل 'الف لیلہ' فورٹ ولیم کالج کے تحت ہی شائع کیا گیا ہو۔

۷۔ پروفیسر حنیف نقوی نے اپنے مضمون میں فسانہ آزاد کے مصنف رتن ناتھ سرشار کے ترجمہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ انتظار حسین نے ''سرشار کی الف لیلہ'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ انتظار حسین لکھتے ہیں کہ 'الف لیلہ' کو اردو مترجموں نے خام مال کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس کا سیدھا سچا ترجمہ ملنا دشوار ہے۔ کبھی ذاتی افتاد کے تحت، کبھی وقت کے رجحانات کے زیر اثر، اس کی کہانیوں کو اپنا رنگ دیا گیا اور اردو میں منتقل کرلیا گیا۔ مزید لکھتے ہیں کہ 'الف لیلہ' میں معنی کی اتنی مختلف سطحیں اور اتنے الگ الگ رنگ موجود ہیں کہ اسے کم و بیش متضاد زاویوں سے پڑھنا بھی ممکن ہے۔ مثلاً اسے بادشاہوں اور امیرزادوں کی داستان کے طور پر بھی پڑھا جاسکتا ہے اور عام لوگوں کی کہانی سمجھ کر بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ اس میں مافوق الفطرت اور اسرار کا رنگ تو ہے ہی مگر اسے حقیقت نگاری کی مثال بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد انتظار حسین لکھتے ہیں کہ ''اس نقطہ نظر سے سرشار کی 'الف لیلہ' مخصوص طور پر دلچسپی کا سامان رکھتی ہے۔ سرشار کی 'الف لیلہ' دوسرے ترجموں سے یوں بھی مختلف ہونی چاہیے کہ وہ خود ایک تخلیقی آدمی تھے۔ محض مترجم ہوتو کتاب کو جوں کا توں ترجمہ میں منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر تخلیقی آدمی کے کچھ اپنے رجحانات بھی ہوتے ہیں۔ کبھی شعوری طور پر، کبھی غیر شعوری طور پر، وہ رجحانات اس کے ترجمے میں راہ پاجاتے ہیں۔ سرشار افسانہ نگار تھے۔ 'الف لیلہ' کا ترجمہ غیر جانب دارانہ شاید ان کے لیے ممکن نہیں تھا اور جب شاعر یا افسانہ نگار کسی شاہ پارے کا ترجمہ کرتا ہے تو اس کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے کیوں کہ وہ ترجمہ کے ساتھ توجیہ و تفسیر بھی ہوتا ہے اور اس طرح ترجمہ کے ساتھ کتاب کے ایک نئے معنی کھلتے ہیں۔ ویسے بھی یہ ممکن ہے کہ ایسے مترجم کے ہاتھوں کتاب کے معنی ہی بدل جائیں۔ سرشار کی 'الف لیلہ' کو دیکھ کر تو کچھ ایسا گمان ہوتا ہے۔'' (علامتوں کا زوال، صفحہ ۱۵۱-۱۵۲)

انتظار حسین نے یہ مضمون ۱۹۶۱ میں لکھا تھا۔ انھوں نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے کہ سرشار کا یہ ترجمہ کب اور کس مطبع سے شائع ہوا تھا۔

۸۔ انتظار حسین کے مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں خاص طور سے خط کشیدہ الفاظ پر غور فرمائیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انتظار حسین کے نزدیک مغربی مصنفین و شعرا میں ''الف لیلہ ولیلہ'' ابھی بھی اجنبی ہے۔ حالاں کہ شواہد اور خود جدید مغربی اسکالرز نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی میں تخلیق ہونے والے ادبیات پر الف لیلہ ولیلہ کے گہرے اثرات ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مغربی مصنفین کی تخلیقات اور کتابوں میں ہم ''اپنے مال'' کی خوشبو پہچاننے سے قاصر رہے ہوں۔

مآخذ

۱۔ حنیف نقوی، ''شبستانِ سُرور کا ماخذ'' مشمولہ ''تحقیق وتعارف''، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۳۔ ص ۱۰۳ تا ۱۱۴

۲۔ ماہنامہ ''معارف''، شبلی نمبر، نومبر۔دسمبر ۲۰۱۴، صفحہ ۱۸۲-۱۸۱

۳۔ *The University Encyclopaedia*، روئیڈن پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ، ۱۹۸۵ء

۴۔ ستار طاہر، ''دنیا کی سو عظیم کتابیں''، کاروانِ ادب، ملتان، ۱۹۸۹ء، اشاعت دوم

۵۔ کیتھلین کوپر (Kathleen Kuiper)، The Thousand and One Nights،

۵۔ The Thousand and One Nights by Kathleen Kuiper (Revised article by Johann Heinrich Voss etc. July 08, 2013), also by Editors of Encyclopaedia of Britannica (Website)

۶۔ دیکھیے وکی پیڈیا: *One Thousand and One Nights*

۷۔ عابد علی عابد، ''داستانِ خرد افروز: ایک جائزہ'' مشمولہ رسالہ ''جامعہ''، نئی دہلی، شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۴ء، جلد نمبر ۱۱۱

۸۔ انتظار حسین، ''علامتوں کا زوال''، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء

۹۔ سیّد امیر علی، ''تاریخ اسلام''، مترجم سید الطاف حسین گیلانی، اسلامک بک سنٹر، نئی دہلی ۲، ۱۹۹۷ء

۱۰۔ رضوان الرحمٰن وسیّد اختر حسین (مرتبین)، *Essays on The Arabian Nights*، پرائمس بکس، دہلی، ۲۰۱۵ء، باراوّل

نجمہ عالم ❁

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.

عابد رضا کے مجموعۂ کلام ''روزنِ سیاہ'' پر ایک نظر

گزشتہ دنوں امریکا (ورجینیا) میں مقیم جدید طرزِ فکر، نئی ڈکشن، تازہ مضامین، سائنسی وخلائی علوم وترقی کو شعری پیکر میں پیش کرنے والے تازہ کار شاعر عابد رضا کا پہلا مجموعۂ کلام موصول ہوا ہے۔ عابد رضا کے کلام سے ہم فیس بک کی مہربانی سے پہلے ہی نہ صرف متعارف بلکہ متحیر ہو چکے تھے متوقع مجموعۂ کلام کے بے چینی سے منتظر بھی تھے۔

یہ شعری مجموعہ دراصل دیگر خصوصیات کے علاوہ اس خوبی کا بھی حامل ہے کہ اس نے اردو شاعری کو عرصے بعد جدید موضوعات سے متعارف کرایا ہے، اس کا مطالعہ قارئین کے لیے حیرت کدہ در حیرت کدۂ کائنات ثابت ہوگا۔

عابد رضا ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی چشم بینا، بیدار ذہن اور اپنی قوت متخیلہ کے علاوہ تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ اپنے اردگرد کا جائزہ لیا ہے۔

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

مگر عابد رضا کہیں سے بھی سرسری نہیں گزرے بلکہ جہان دیگر میں بھی جہانِ دیگر تلاش کرتے رہے، دیکھتے سب ہیں مگر اس مشاہدے سے اپنے مطالعے میں اضافہ کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں اور یہی بات عابد رضا میں بہ درجۂ اتم موجود ہے جو انھیں حیرت کدۂ جہاں سے مزید حیرت کشید کرنے پر اکساتی ہے۔ علامہ نے فرمایا تھا کہ:

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو ہی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

تو عابد رضا شاید اسی راز کو بے نقاب کرنے کی جستجو میں ہی سرگرداں ہیں یہی تلاش ہے یہی جستجو یہی تحقیق عابد رضا کو اب تک کے تمام اردو شعرا سے منفرد کرتی ہے۔

اردو ادب بطورِ خاص، شعری ادب میں ابتدا سے میر و غالب بلکہ آج تک موضوعات تو گویا طے شدہ ہیں دکنی شعرا ہوں یا شمالی ہند کے شعرا سب کے یہاں موضوع عشق ومحبت، محبوب کی ادائیں، تکبر وناز، احساسِ حسن، ہجر کا عذاب، وصل کی آسودگی وغیرہ رہے ہیں۔ ہر شاعر اپنے انداز واسلوب سے اپنا منفرد مقام اپنا جداگانہ انداز رکھتا ہے۔ یہاں اسالیب نہیں موضوع پر بات کرنا ہے

❁ برقی پتا: najmaalam.jafri@gmail.com

موضوع تو بنے بنائے تھے جب تک غالب کوچۂ محبوب میں سرگرداں رہے محبوب کے در پر پڑے رہے تو واہ واگر جب انھوں نے ان موضوع سے ہٹ کر فرمایا:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

تو لوگوں نے چونک کر دیکھا کہ یہ کیا فرمارہے ہیں؟ اور اس وقت تو حیرت کے پہاڑ ہی ٹوٹ پڑے جب غالب نے کہا:

لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

تو آواز بلند ہونا شروع ہوگئی کہ:

مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

یہاں اردو ادب کی تاریخ بیان کرنا مقصد نہیں ہے مگر موضوع کی طرف آنے کے لیے غالب کا ذکر ضروری تھا کیوں کہ غالب شاید پہلا شاعر ہے جس نے مروجہ موضوعات سے باہر آ کر بھی اپنے ذہن کو مہمیز کیا۔ غالب فکرِ جدید کا شاید پہلا شاعر تھا۔

مجھ سے پہلے غالب ہوا، اُس کے بعد ہوں میں

تو یہ ہے شاعری میں عابد رضا کا، سلسلۂ نسب۔ شاعری میں عابد رضا، غالب جیسی جدید سوچ کے حامل ہیں۔ وہ ہونہار شاعر ہیں جو جدید سے جدید موضوعات پر روانی سے لکھ رہے ہیں مگر عابد رضا کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کو تازہ اور جدید موضوعات سے نہ صرف ثروت مند کیا بلکہ شاعری کے مروجہ اصول وضوابط کو بھی کہیں مجروح نہیں ہونے دیا۔

اردو غزل کی تمام تر نزاکتوں کو ملحوظ رکھا اور نظم کے تمام تر تقاضوں کو پورا کیا۔ ردیف قافیہ بحر وزن کے ساتھ سائنسی غزل کو اس قدر آسانی سے ادا کرنا عابد رضا کا اصل کمال ہے۔

عابد رضا، غالب کی فکر سے بھی آگے کی کیفیت سے آگاہ ہیں:

جب باغِ عدن میں ہوئی برباد خدائی
ہم نے بھی زمین تیری طرف جست لگائی

عابد تاریخ، سائنس، فلسفہ، معاشرتی روایات، داستانوی کرداروں تصوف حتیٰ کہ اساطیری واقعات کو غزل میں بڑی یکسوئی اور دل پذیری سے آمیز کرنے کے ہنر سے خوب واقف ہیں، جدید وقدیم علوم سے آمیز اور مزین موضوعات سے غزل کے تن مردہ میں ایک نئی اور تازہ روح پھونکنے کی کوشش کی ہے۔

عابد رضا کے پہلے مجموعہ کلام ''روزنِ سیاہ'' کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ اردو شاعری کی تمام اصناف کا بہترین مجموعہ ہے اس مجموعے میں حمد، نعت، منقبت سب ہیں۔ عابد رضا کا اپنا ہی منفرد انداز ہے یہاں میں صرف ایک دو شعر ہی بطور مثال پیش کروں گی:

جب چشم تخیل کو ملا کوئی پری زاد چہرے کی جگہ ہم نے تیری شکل بنائی

دن چڑھا سر پہ کفن باندھ کے تنہائی کا
اور پھر دل میں اتر آئی تیری یاد کی رات

ایک مدت ہوئی پیار کے شہر میں اس سے بچھڑے ہوئے
دو گھڑی کو ملے گر کہیں پوچھنا ''وقت ہے''؟

بدن کی آگ تو بجھنے کو ہے مگر اب بھی
تمام رات سلگتا ہے درد گھاؤ میں

''روزنِ سیاہ'' تمام اصنافِ سخن کا مجموعہ ہے (بلحاظِ موضوع، بلحاظِ ہیئت نہیں)۔ حمد، نعت، مٹی سے محبت کے رنگ رثائی کیفیات پر بھی اشعار اس مجموعے میں مل جائیں گے۔ عابد رضا کا ایک شعر ہے:

اگر میں گردشِ دوراں پہ دسترس رکھتا
ستارہ گاہ فلک بوس پر فرس رکھتا

اس شعر کے لفظ ''اگر'' میں خالق و مخلوق کا مکمل و بھرپور تعارف اور معبود و عبد کے تعلق کا مکمل ادراک بھی موجود ہے یہ ''اگر'' بتا رہا ہے کہ گردشِ دوراں پہ دسترس کسی اور کی ہے مگر اللہ کی خصوصی اور چہیتی مخلوق ہوتے ہوئے انسان ہی وہ مقام رکھتا ہے کہ اپنی صلاحیت اور جستجو سے ستارہ گاہِ فلک بوس تک اگر رسائی ہے تو صرف اسی کی ہے، عابد رضا تو سرحد امکاں سے بھی آگے کے امکانات پر غور و فکر رکھتے ہیں۔

گردوں پہ کمندیں ڈال چکے، خورشید اچھالا نیزے پر
امکان کی سرحد پار ہوئی، اب آگے کی تیاری ہے

یہ ہی نہیں مٹی سے محبت بھی اس مجموعے ''روزن سیاہ'' میں نظر آتی ہے:

خاک میں مل گئے، جانے کتنے بھگت سنگھ جیسے جواں
اپنی مٹی کے رنگوں سے الفت کا رشتہ جنوں خیز تھا

کچھ رنگ نظم ''شہرِ آزردگی'' میں جھلک رہا ہے۔ رثائی اشعار بھی اس مجموعۂ کلام میں ملیں گے۔

سفر کی شام تھکن بے پناہ تھی میری
کنارے آبِ رواں خیمہ گاہ تھی میری

یا یہ شعر:

میرے حریف ہیں سب کوفہ و دمشق نژاد
میں کیا بتاؤں انھیں کربلا کے بارے میں

ہم دشتِ بلاخیز کی مٹی سے بنے تھے
عاشور کے دن سرخ ہوئی خاک ہماری

جدید سائنسی ایجادات و ترقی، علم فلکیات، تاریخی آگاہی، اساطیری کردار داستانیں، اجرامِ فلکی حتیٰ کہ تاریخی ادب، جدید شعری

آہنگ اگر یکجا دیکھنا ہو تو عابد رضا کے مجموعے کلام،، روزنِ سیاہ،، کا مطالعہ ضرور کیجیے،، حقیقت تو یہ ہے کہ اس مجموعے میں موجود نظمیں بھی قابلِ ذکر ہیں مگر اتنا کچھ لکھنے پر ابھی غزلوں ہی کا حق ادا نہ ہو سکا۔ لہٰذا نظموں پر پھر کبھی، اس حیرت کدۂ شعری مجموعہ پر قلم اٹھاتے ہوئے خیال آتا ہے کہ ''بہت کچھ'' کے باوجود ابھی ''بہت کچھ'' باقی ہے کہنے کے لیے۔

ہاں عابد رضا کی اس انوکھی، منفرد شاعری نے اردو غزل کو جدید موضوعات ہی نہیں دیے، بلکہ جدید راہ پر گامزن بھی کیا ہے، آج کا دور ادب سے جو توقعات وابستہ کر سکتا ہے عابد رضا نے اس کو مکمل طور پر مدِ نظر رکھا ہے۔

عابد رضا کے اوّلین مجموعۂ کلام سے کچھ اور اشعار پیش کرتی ہوں تاکہ قارئین کو اس جدید طرز کے کلام سے مزید آگاہی ہو سکے:

ممکن سے پرے چشمِ کم اندیش سے آگے
حیرت کا سفر لمحۂ درپیش سے آگے

خلا میں بھیج اُڑن طشتری تحیر کی
بڑھا کے تیز قدم دشتِ بے گیاہ میں رکھ

زمیں پہ روبوٹ اپنے آنسو کا ذائقہ تک بتا رہے ہیں
مشین زادوں پہ کیا کرامت اتر رہی ہے عجب گھڑی ہے

کوئی جواں پھر جلا رہا ہے خدائی آتش کدے سے مشعل
زمین کی حرکت سے آسمانوں پہ کھلبلی ہے، عجب گھڑی ہے

ہوتی ہے عطا شاہ سے روبوٹ کو خلعت
مطلوب ہے دربار میں شاعر نہ لکھاری

اب تو اس شہر میں بس مشینی ذہانت کی بھر مار ہے
ایک دن تھا کہ یہ مردِ آگاہ بھی فکر آمیز تھا

خوان پر ایک طلسمی ضیافت سجائی گئی تھی یہاں
کرۂ ارض تو آسماں سے زیادہ فسوں خیز تھا

جامِ جم سے انٹرنیٹ تک حیرت جب ایجاد ہوئی
سات سمندر پار کے قصے جادو ٹونے لگتے تھے

خان حسنین عاقب ❁

اینٹی غزل کے دامن میں پلتی گنجائشیں

کلاسیکی اردو ادب کے لیے بیسویں صدی کی ابتدائی چند دہائیاں، بلکہ پہلی نصف صدی کا دورانیہ نشاۃ الثانیہ ثابت ہوا۔ یہ دور کلاسیکی اردو نثر اور کلاسیکی اردو شاعری، دونوں زمروں میں وقوع پذیر ہوا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جب کہ دنیا پہلی جنگ عظیم کے بھیانک، دلسوز اور انسانیت کا دل دہلا دینے والے اثرات اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھنے لگی تھی، ادبی رجحانات آہستہ آہستہ کروٹ بدل رہے تھے۔ دوسری دہائی ختم ہوتے ہوتے جنگ عظیم اول بھی اختتام پذیر ہوگئی اور اس کے انتہائی دور رس اور ہولناک نتائج بھی بڑی تیزی سے دنیا کے سامنے آگئے۔ یہ نتائج دیکھ کر مفتوح ممالک کے ساتھ ساتھ فاتح ممالک بھی سہم کر رہ گئے۔ دنیا بھر میں لکھا جانے والا ادب ان نتائج کی ہولناکی سے لرز اٹھا اور وہ سارے موضوعات جنھیں ادب محض انسانوں کی تفنن طبع کے لیے منہ لگایا کرتا تھا، جنگ عظیم کے بعد تیزی سے رونما ہونے والی صورتحال، اقدار کی ابتری اور دنیاوی نظام کے درہم برہم ہونے کے موضوعات کا ذائقہ چکھنے لگا۔ افسانہ نگار، ادیب، شعراء اور ناول نگاروں نے انسانی ابتلاء اور اخلاقی اقدار کی تنزلی کا نوحہ لکھنا شروع کر دیا۔ معاشی کساد بازاری اور کسمپرسی کے اس عالم میں انسانوں پر جو گزرنے لگی، ادب میں وہی رقم ہونے لگا۔ ادب کے اس نئے رجحان کو ایک نیا نام دیا گیا 'ترقی پسندی'۔ ترقی پسندی کے رجحان کے تحت ادب میں انسانی تجربات، مشاہدات، معیشت، معاشرتی اقدار، ظلم و ناانصافی، استحصال جیسے سماجی evils کو موضوع بنا کر تخلیقات لکھی جانے لگیں۔ ادب کی ہر صنف میں اسی رجحان کو پروان چڑھایا جانے لگا۔ دنیا بھر میں یہی رجحان چل پڑا۔ اردو اس سے الگ کیسے اور کب تک رہ سکتی تھی؟ لہٰذا بیسویں صدی عیسوی کی چوتھی دہائی سے پریم چند کی حمایت کے ساتھ ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ دوسری جنگ عظیم، پھر مختلف ممالک میں تحریکات آزادی اور پھر ہندوستان کی آزادی تک حالات اتنی تیزی سے اپنا روپ بدلتے چلے گئے کہ یہ اندازہ ہی نہیں ہوسکا کہ کلاسیکی ادب کہیں بہت پیچھے چلا گیا ہے۔ یہ رجحان بیسویں صدی کی چھٹی دہائی تک اپنی رفتار سے چلتا رہا۔ پھر اقوام متحدہ اور مختلف ممالک کے باہمی امن معاہدوں کی وجہ سے دنیا کے حالات کسی حد تک درست ہونے لگے تو ترقی پسند رجحانات کو بھی جیسے گرہن لگ گیا۔ اس کی رفتار دھیمی ہوتے ہوتے اتنی سست ہوئی کہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت نے اسے ایک ہاتھ سے بازو کر کے اس کی جگہ لے لی۔ چوں کہ جدیدیت کی تحریک ترقی پسند تحریک کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئی تھی اس لیے اس نئی تحریک کی بنیاد ہی ترقی پسند نظریات سے انحراف پر رکھی گئی تھی۔ اس کے بعد جدیدیت سے منحرف ہو کر مابعد جدیدیت کی تحریک وجود میں آئی۔

❁ پرنسپل، جی این اے کالج، پوسد، مہاراشٹر، ہندوستان۔ برقی پتا: hasnainaaqib1@gmail.com

ان سب سرگرمیوں کے انجام پذیر ہوتے ہوتے ایک تبدیلی ایسی بھی آئی جس نے اب تک سب سے محفوظ سمجھی جانے والی صنفِ شاعری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یعنی غزل۔ غزل کے مقابلے میں ایک تحریک شروع ہوگئی جسے اینٹی غزل کا نام دیا گیا۔

اینٹی غزل کیا ہے؟ اس کی نوعیت کیا تھی؟ تو پھر کیا اس تحریک کی وجہ سے غزل کی صنف کو نقصان پہنچا؟

کیا یہ تحریک دیر پا ثابت ہوسکی؟ اب یہ کہاں پائی جاتی ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہم اس مقالے میں تلاش کریں گے۔

جیسے کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ اینٹی غزل تحریک ایک فکری تحریک تھی جس کے اپنے معیارات اور پیمانے متعین کیے گئے تھے۔ یہ تحریک غزل مخالف تحریک تھی۔ لیکن دیگر بہت سے اہل علم کے ساتھ ساتھ راقم کے ذہن میں بھی یہ خیال آیا کہ اینٹی غزل، غزل کے کس پہلو سے منحرف تھی؟

کیا اینٹی غزل، بطور صنف غزل کی حیثیت سے منحرف تھی؟

کیا اینٹی غزل، غزل کی ہیئت میں تبدیلی کے لیے چلائی گئی تحریک تھی؟

کیا اینٹی غزل کوئی ہیئتی تجربہ تھا؟

کیا اینٹی غزل غزل کے موضوعاتی کینوس سے باہر نکل کر بات کرنے والی تحریک تھی؟

اینٹی غزل نے غزل کی کس روایت سے انحراف کیا؟

یہ اور اس جیسے بہت سے سوالات ہیں جو اینٹی غزل کی اصطلاح کانوں پر پڑتے ہی ایک مبتدی سے لے کر ایک ادبی محقق تک کے ذہن میں جگمگانے لگتے ہیں۔ راقم نے جب اینٹی غزل کی اصطلاح اور اس کی مبادیات پر تفصیلی تحقیق کی تو بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوا اور اس موضوع کے تعلق سے ذہن میں لگے بہت سے جالے بھی صاف ہوگئے۔

اینٹی غزل سے پہلے اردو غزل کلاسیکی روایات کی پابند تھی۔ کلاسیکی غزل صدیوں قبل اپنے آغاز سے لے کر بیسویں صدی عیسویں میں داغ، اقبال، سیماب، جگر اور فراق گورکھپوری تک، لگے بندھے موضوعات کے بندھن میں بندھی ہوئی تھی۔ چند تجربات ضرور کیے گئے تھے لیکن غزل کا فارم ہی ایسا تھا کہ اس میں کلاسیکی موضوعات سے باہر نکل کر سوچنا شعراء کی اکثریت کے لیے سوہان روح ثابت ہوتا تھا۔ حالاں کہ نظموں کے موضوعات کی ردائے کہنہ کب سے چاک کردی گئی تھی اور نظم گو شعراء نئے موضوعات کو نئی نظم کے عنوان کے تحت رقم کر رہے تھے۔ لیکن غزل کلاسیکی جامہ اتار کر نیا پیرہن زیب تن کرنے سے ہنوز گریزاں تھی۔ اسی رجحان سے انحراف نے چند لوگوں کے اذہان میں غزل کے رد میں ایک نئے رجحان کو متعارف کروانے کا خیال پیدا کیا۔ اینٹی غزل تحریک دراصل اسی روایت شکن رجحان کی پیداوار ہے۔ اس تحریک نے غزل گو شعراء کے ایک گروہ کے ذہن میں یہ بات بٹھادی کہ غزل کب تک کہنگی اور فرسودگی کا بوجھ ڈھوتی رہے گی؟ اس میں بھی کچھ نیا کام ہونا چاہیے۔ سو یار لوگوں نے اس میں نئے تجربات شروع کردیے۔

اب سوال یہ تھا کہ تجربہ کس پہلو سے، کس زاویے سے کیا جائے؟

آیا یہ تجربہ ہیئت کے ساتھ کیا جائے؟

لیکن ہیئت کے ساتھ تجربے میں کوئی گنجائش باقی نہیں تھی۔ اس لیے کہ ترقی پسند تحریک اور پھر اس کے بعد جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی تحریکوں کے دوران بھی ہیئتی تجربے کیے جاچکے تھے اور ان میں سے اکثر بری طرح فلاپ ہوچکے تھے۔ بہت سے تجربات کی بنیاد مغربی ادب کی نقالی میں دھری ہوئی تھی۔ مثلاً انگریزی شاعری میں موجود بلینک ورس اور فری ورس نے اردو میں آزاد نظم، معریٰ نظم، نثری نظم، آزاد غزل جیسے ہیئتی تجربات کو راہ دی۔ جس طرح اردو تنقید مغربی تنقید کے زیرِ اثر رہی اسی طرح اردو شاعری میں ہونے والے ہیئتی تجربات بھی مغربی شاعری ہی کے زیرِ اثر رہے۔ آزاد نظم نے تو اردو میں کئی دہائیوں کے بعد اپنی گرفت اچھی خاصی مضبوط کرلی ہے لیکن نثری نظم اور آزاد غزل جیسے ہیئتی تجربات ہنوز اپنے وجود کو منوانے کی جی توڑ کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مستقبل قریب میں ان کی قبولیت کے امکان قوی نہیں نظر آتے۔

رہی بات اینٹی غزل کے رجحان کی تو اینٹی غزل بھلے ہی ایک تجربہ سہی اور یہ تجربہ متنازعہ سہی لیکن اس کی نوعیت پر سیر حاصل گفتگو وقت کا تقاضا بھی ہے اور ضرورت بھی۔

اینٹی غزل دراصل ہیئتی نہیں بلکہ موضوعاتی تجربہ تھا۔ اس تحریک نے غزل کے روایتی فارم پر کوئی بحث نہیں کی البتہ اس نے روایتی اور کلاسیکی غزل کے موضوعات کو چیلنج کیا۔ وہ غزل جس نے صدیوں کا طویل سفر طے کرکے بیسویں صدی میں قدم رکھا تھا، اس کے موضوعات ہنوز عشق و عاشقی، حسن و جمال، گل و بلبل، شراب اور ساقی، نشہ وخمار، محبوب اور رقیب، گیسو، لب و رخسار وغیرہ کے بیان سے وابستہ تھے جس نے غزل کے چاہنے والے لیکن نئی سوچ کے حامل لوگوں کو کچھ نیا سوچنے پر مجبور کردیا۔

روایتی اور کلاسیکی غزل کو عرب اور عجم کا سہارا تھا لیکن اردو غزل کی تخصیص کریں تو اس نے برصغیر ہند و پاک میں اپنی مقبولیت کے جھنڈے گاڑ رکھے تھے۔ کلاسیکی اور روایتی غزل کے دلدادہ لوگ ہیئتی اور موضوعاتی، دونوں سطحوں پر کسی نئی بات کو سننے کے متحمل نہیں تھے۔ ایسے میں صدیوں سال پرانی غزل موضوعاتی لحاظ سے تھکی تھکی سی نظر آرہی تھی جو نئی فکر اور نئے رجحانات رکھنے والوں کو پسند نہیں تھا۔ انھوں نے روایتی موضوعات کو چیلنج کرنا شروع کردیا اور غزل میں ایسے موضوعات کو ضم کرنا شروع کردیا جو ایک دم نئے تھے۔ یہ موضوعات معاصر شعری رجحانات کی نمائندگی بھی کررہے تھے لیکن قدامت پسند لوگوں کو یہ بات قبول نہیں تھی۔

اسی اینٹی غزل کی تحریک نے جس غزل کو پروان چڑھایا، اسے 'نئی غزل' کے نام سے بھی پکارا گیا۔ یعنی تحریک کا نام تو اینٹی غزل تحریک تھا لیکن غزل کی نوعیت کو جو نام دیا گیا، وہ نئی غزل تھا۔

نئی غزل کے امکانات کو وسیع کرنے کے لیے ان تجربہ پسند لوگوں کا ایک گروہ تیار ہوگیا جس نے غزل کے موضوعات کے کینواس کو معاصر سماجی رویوں، سیاسی منافقت، اخلاقیات وغیرہ پر اپنی تخلیقی توانیاں خرچ کرنی شروع کردیں۔ اینٹی غزل تحریک والے گروہ نے جب غزل کہنی شروع کی تو اس میں نئے رجحانات اور معاصر معاشرتی رویوں کی جھلک ہی نہیں تھی بلکہ نمایاں طور پر یہی رویے اس کی بنیاد بن گئے تھے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی اس نئی غزل کے تعلق سے اپنے ایک اہم تنقیدی مضمون میں رقم طراز ہیں:

جدید تر شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے مقررہ نظریوں، خانوں، فارمولوں اور

نعروں سے اپنا دامن چھڑالیا ہے اور کسی وقتی یا ہنگامی مسلک یا نصب العین سے وابستگی کے لیے اپنے ذہن کو آمادہ نہیں کر پاتا۔ اس نے ان لکیروں اور پلوں کوتوڑ دیا ہے اور زندگی کے ناپید اکنار سمندر میں داخل ہوگیا ہے۔ وہ زندگی کی وحدت کو اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ دیکھنا، برتنا اور سمجھنا چاہتا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کی اس رائے کے مطالعے کے بعد یہ واضح ہوجاتا ہے کہ نئی غزل یعنی جدید غزل نے اب تک تسلیم نہ کی گئی باتوں کو تسلیم کرنے اور کروانے کی سمت پیش رفت کی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اینٹی غزل یا نئی غزل کی جھلکیاں ہمیں روایتی غزل میں نہیں ملتیں، وہ پرانی غزل میں بھی مل جاتی ہیں لیکن وہ مقدار اور تعداد میں اتنی کم ہیں کہ انھیں لے کر کوئی تحریک نہیں چلائی جاسکتی تھی اور اس کی مثالیں بھی منتشر اور خال خال تھیں۔ لیکن اسے ایک مستقل رجحان اور تحریک کی شکل میں نئی نسل کے شعراء نے ہی منظم کیا اور اسے دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا۔

نئی یا جدید غزل کا لسانی آہنگ، استعاراتی نظام اور اس کا اسلوب، سب کچھ نیا اور منفرد تھا۔ اس کی لفظیات ہی کو لے لیں۔ وہ الفاظ جو روایتی غزل کے حاملین کے نزدیک ممنوع اور معتوب ٹھہرتے ہیں، نئی غزل کہنے والے ان الفاظ پر والا وشیدا دکھائی دیتے ہیں۔

اسی وجہ سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ذاتی طور پر مجھے لگتا ہے کہ نئی نسل کے لیے نئی اور جدید غزل کہنا بڑی محنت اور مشقت کا کام تھا۔ یہ کوئی لکیر پر لکیر کھینچنے کا عمل نہیں تھا بلکہ یہ اپنا کنواں کھودنا اور اپنا پانی پینا کے مصداق عمل تھا۔ ایک نئی راہ، ایک نئی ڈگر کی تعمیر تھی جس پر صرف معمار کو نہیں چلنا تھا بلکہ اگلی نسلوں کو بھی اسی کو اپنی راہ گزر بنانا تھا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی ایک جگہ لکھتے ہیں:

> جدید شاعروں کی ایک نسل ایسی پیدا ہوچکی ہے جو انکار و اثبات کے دوراہے پر اپنی شخصیت اور اپنے ذہن کو پارہ پارہ ہوتے دیکھ رہی ہے۔ یہ نسل جو نہ کافر ہے نہ مومن، زندگی، زمانہ، انسان، تہذیب اور کائنات کی ہر آن بدلتی ہوئی متحرک اور تغیر پسند حقیقت کو سمجھنا چاہتی ہے۔ وہ انسان اور فطرت، جماعت اور فرد، محبت اور نفرت، ظاہر اور باطن، غم اور مسرت، زندگی اور موت، کفر اور ایمان کے ناگزیر لیکن بدلتے ہوئے رشتوں کو سمجھ کر زندگی کے آہنگ کو دریافت کرنا چاہتی ہے۔

انکار و اثبات کی یہ الجھن کیا ہے؟ کیا یہ وجود اور عدم وجود کے کناروں پر کھڑے رہ کر اپنی راہ کے انتخاب سے متعلق الجھن اور تذبذب ہے؟ یا پھر یہ ایسا دوراہا ہے جہاں سے آگے مزید کئی راہیں کھلتی ہیں اور پھر کھلتی چلی جاتی ہیں؟ ظفر اقبال کو دیکھئے کہ انھوں نے غزل کی تغیر پذیری کو کس چابکدستی سے برتا ہے۔

کاغذ کے پھول سر پہ سجا کے چلی حیات
نکلی برونِ شہر تو بارش نے آلیا

کاغذ کے پھولوں کو سر پر سجا کر زندگی کا چلنا روایتی غزل کا موضوع ہرگز نہیں ہو سکتا۔ غزل کی روایت میں زندگی کی تجسیم تو کی گئی ہے بلکہ اتنی کی گئی کہ روایتی غزل میں بھی یہ موضوع پامال اور فرسودہ ہو چکا ہے لیکن جب سیاق و سباق تبدیل ہو جاتا ہے تو پامال موضوع بھی اپنی معنویت تبدیل کر دیتا ہے۔ اس شعر میں بھی وہی ہوا۔ زندگی جب کاغذ کے پھول سر پر سجا کر نکلی تو شہر سے باہر نکلتے ہی بارش نے اسے آلیا۔ یعنی سر منڈاتے ہی اولے پڑنے شروع ہو گئے۔ یہ کوئی تصوراتی فریب نہیں ہے بلکہ نہایت قریب از حقیقت، بیان ہے لیکن جس انداز میں اسے غزل کے ساتھ نتھی کیا گیا ہے، وہ اسے ایک نیا آہنگ عطا کرتا ہے۔ ظفر اقبال کی اگر بات کریں تو ان کی ادبی زندگی ہمیں تین ادوار میں منقسم ملتی ہے۔

دورِ اول 'آبِ رواں' کی اشاعت کا دور تھا۔ اس دور میں ظفر اقبال کی شاعری جو ہمیں 'آبِ رواں' کے مطالعے سے معلوم ہوتی ہے، روایت سے بغاوت کا دور نہیں تھا بلکہ شاعری پر ان کے یقین کا دور تھا۔ البتہ دوسرا دور روایتی غزل سے انحراف، تجربہ پذیری اور نئے شعری رجحان کی آبیاری کا دور تھا جس میں انھوں نے اینٹی غزل جیسے تجربات کیے۔ یہ الگ بات ہے کہ اینٹی غزل کے تجربات زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔

اور تیسرا دور وہ تھا جب وہ دوبارہ شاعری کی اصل روح سے رجوع ہوئے اور پھر اسی کے ہو رہے۔ لیکن ایک بات کہنی لازم ہے کہ ظفر اقبال نے اینٹی غزل یا نئی غزل کے جو تجربات کیے، ان میں وہ غزل کی کلاسیکی روایات اور پیمانوں پر بھی پورے اترتے دکھائی دیتے ہیں۔ ظفر اقبال کے نئی غزل کے چند مزید اشعار دیکھیے:

مجھے کبڑا نہ سمجھو، زندگی پر — میں ہنستے ہنستے دُہرا ہوگیا ہوں
جو بدلا ہے میرے اندر کا موسم — تو پتھر سے پرندہ ہوگیا ہوں

کبڑا ہونا، دوہرا ہونا اردو غزل کے لیے قدرے نامانوس یا کم مانوس ترکیبات ہیں لیکن ظفر اقبال کی یہی لفظیات نئی غزل کے رجحان کو فروغ دینے کا باعث ہوئی۔ رہی بات پتھر سے پرندہ ہونے کی تو وہ بھی ایک اسطوری فلسفے کی سمت اشارہ ہے جس کا مضمون اردو غزل میں نامانوس نہ سہی لیکن پامال اور فرسودہ بھی نہیں ہے۔

سلیم احمد کی اینٹی غزل دیکھیے:

زندگی موت کے پہلو میں بھلی لگتی ہے — گھاس اس قبر پہ کچھ اور ہری لگتی ہے
روز کاغذ پہ بناتا ہوں میں قدموں کے نقوش — کوئی چلتا نہیں اور ہم سفری لگتی ہے
گھاس میں جذب ہوئے ہوں گے زمیں کے آنسو — پاؤں رکھتا ہوں تو ہلکی سی نمی لگتی ہے

اسی ضمن میں سلیم احمد کے مزید چند اشعار دیکھیں:

افق پہ دیکھتا تھا میں قطار قازوں کی — مرا رفیق کہیں دور جانے والا تھا
مرا خیال تھا یا کھولتا ہوا پانی — مرے خیال نے برسوں مجھے ابالا تھا

زندگی اور موت کو پہلو بہ پہلو دیکھنا، کاغذ پر قدموں کے نشان بنانا، گھاس میں آنسوؤں کا جذب ہونا، قازوں کی قطاریں، کھولتا

پانی اور اس کا ابلنا وغیرہ بھی ایسی ترکیبات ہیں جو اردو غزل کے روایتی مزاج سے ہم آہنگ نہیں محسوس ہوتیں لیکن روایت سے اسی بغاوت نے نئی غزل کو جنم دیا تھا۔

اس نئی غزل نے چوں کہ روایتی اور کلاسیک غزل کے خلاف جا کر اپنا ایک نیا لفظیاتی نظام تشکیل دیا تھا اس لیے اسے اینٹی غزل یا غزل مخالف رجحان قرار دیا گیا۔

اینٹی غزل کی خاصیت یہی ہے کہ اس نے اپنے سفر کا آغاز اس وقت کیا جب جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی بحثیں اپنے عروج پر تھیں۔ لیکن نئی غزل یا اینٹی غزل کو اپنا مقام بنانا تھا۔ محمد خالد نے 'نئی پاکستانی غزل، نئے دستخط' کے عنوان سے ایک انتخاب شائع کیا جس میں انھوں نے اپنے معاصر شعراء کی پانچ پانچ غزلیں شامل کیں۔ ستر کی دھائی میں شائع ہونے والی یہ کتاب جدید نظریہ ساز غزل کا نمائندہ انتخاب تھا جس میں سلیم کوثر، ایوب خاور، محمد خالد، ثروت حسین اور افضال احمد وغیرہ شامل تھے۔ محمد خالد کے یہ اشعار دیکھئے:

ان ستاروں میں کوئی مشعل مہتاب جلا اپنے خوابوں میں کبھی دیکھ ہمارا کوئی خواب

ڈال لیتے ہیں بھلا زنجیر عشرت پاؤں میں تان کر چلتے ہیں سر پر در کی چادر کہیں

دل کے اندر چپکے چپکے جاگتی ہے بے کلی شور کرتی ہیں ہوائیں جسم کے باہر کہیں

آنکھ میں بیداریوں کی دھول گرتی جائے گی آسماں سر پر اٹھائیں گے مہ و اختر کہیں

نئی غزل میں استعارہ سازی کو ایک نازک فن کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ نئی غزل جسے ہم اس مقالے میں اینٹی غزل کہتے آرہے ہیں، محض استعاروں کا پٹارا بھی نہیں ہے بلکہ استعاروں کو ان کے تمام تر aesthetic اوصاف کے ساتھ پیش کرنے کا مقام ہے۔

باندھ کر بندھ تجھ کو روک لیا
معرکہ ہوگیا ہے سر دریا
(حسنین عاقب)

رؤف پاریکھ کی رائے میں نئی غزل نے بیسویں صدی کے آخری ربع میں روایتی غزل کے منظرنامے کو تبدیل کرنے میں اہم کردار نبھایا ہے۔ اور اس انقلابی تبدیلی کے پیش رو ظفر اقبال ہیں جو اسی وقت اپنے شعری مجموعے 'گل آفتاب' کے ساتھ منظر عام پر آئے۔ رؤف پاریکھ کا ماننا ہے کہ اینٹی غزل کی فرہنگ نہایت shocking تھی۔

نئی غزل کے پیش رووں میں نمایاں طور پر سلیم احمد اور ظفر اقبال کے نام واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں لیکن ڈاکٹر تبسم کاشمیری ماہ نامہ ''لوح'' راولپنڈی کے اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۵ کے شمارے میں لکھتے ہیں کہ 'نئی غزل کے تجربے کا سہرا ظفر اقبال کے سر بندھتا ہے۔ ظفر اقبال کے بہت سے اشعار تو تخلیقی اعتبار سے اس نوعیت کے ہیں کہ انھیں پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ یہ اردو غزل کی ایک الگ

ہی دنیا ہے۔لیکن اسی کے ساتھ تبسم کاشمیری یہ بھی کہتے ہیں کہ نئی غزل میں ظفر اقبال نے غزل کی زبان کے ساتھ جو تجربہ کیا، اس نے روایتی اور کلاسیکی غزل کی روایت کو لہولہان کر دیا۔اس کی ضرب قاری پر بھی پڑی۔'

اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ اردو غزل کا مزاج بہت نازک ہے اس کی نازک مزاجی کثیر الابعاد ہے۔اس کے پہلوؤں کی تکثیر نئے نئے انکشافات کرتی ہے۔

نئی غزل کی وہی مثالیں مقبول اور کامیاب ہو سکیں جن میں درج ذیل عناصر کی شمولیت نے کلاسیکی غزل کی روح کو متاثر نہیں ہونے دیا۔

۱۔ غزل کے روایتی موڈ کی پاسداری

۲۔ عصری حسیت

۳۔ غزل کا اسلوب

سلیم احمد، ظفر اقبال اور دیگر شعرا کے تتبع میں جن لوگوں نے اینٹی غزل رجحان کی پیروی کی، وہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکے اور پھر کہیں گم ہو گئے۔ظفر اقبال اس لیے کامیاب ہو گئے کہ انھوں نے محض اینٹی غزل پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ کلاسیکی غزل کے سخت پیمانوں پر بھی پورے اترے اور کھرے اترے۔جب کہ اینٹی غزل کے دیگر پیروکاروں کا سرمایہ یہی اینٹی غزل کا رجحان تھا جسے وہ کل وقتی رجحان کے طور پر سنبھالتے رہے لیکن بطور شاعر خود سنبھل نہیں پائے۔لیکن کہیں کہیں پرانے اور نئے، دونوں زمانوں کے شعراء کے یہاں بھی ایسی مثالیں مل جاتی ہیں جنھیں ہم اینٹی غزل رجحان کا عکس کہہ سکتے ہیں، اگرچہ کہ یہ مجموعی طور پر اینٹی غزل کے شعراء نہیں ہیں۔ان شعراء کے یہاں اس طرح کی لفظی تراکیب نئی یا اینٹی غزل کی مشابہت تو رکھتی ہیں لیکن اینٹی غزل کا پروپیگنڈا نہیں بن سکیں۔

وزیر آغا کا یہ شعر دیکھیے:

کرنا پڑے گا اپنے ہی سائے میں اب قیام
چاروں طرف ہے دھوپ کا صحرا بچھا ہوا

باقر مہدی کو ہم روایت شکن شاعر اور سخت نقاد کے طور پر جانتے ہیں۔ان کا ایک شعر دیکھیے:

زمینِ سرد سے اک گرم آب جو نکلی
پہاڑ کاٹ کے دریا کا راستہ نکلا

سلیم شہزاد مالیگانوی (انڈیا) کے یہاں نئی غزل اور جدید لہجے کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔ہم انھیں ایک لحاظ سے نئی غزل کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔سلیم شہزاد کے چند اشعار نئی غزل کے ضمن میں ملاحظہ کیجیے:

گھبرا کے بلبلے نے سمندر کی ذات سے		پھیلا دیا وجود کو ساری دشاؤں میں

کشتیوں کو پھونک کر آگے نہ بڑھ		ڈوب جائے گا جزیرہ، سوچ لے

محمد علوی کے یہاں یہ مثال مل جاتی ہے۔

لمبی سڑک پہ دور تلک کوئی بھی نہ تھا
پلکیں جھپک رہا تھا دریچہ کھلا ہوا

دریچے کا پلکیں جھپکانا شاید اردو غزل کے لیے تجسیم کاری کی ایک نسبتاً کم معروف مثال ہے۔
عادل منصوری کے یہاں بھی یہ مثال مل جاتی ہے۔

شاید کوئی چھپا ہوا سایہ نکل پڑے
اجڑے ہوئے بدن میں صدا تو لگائیے

بدن میں صدا لگانا بھی ایک نیا تلازمہ تیار کرتا ہے۔
حسنین عاقبؔ کے یہاں کلاسیکی غزل کا رچاؤ گہرا ہے لیکن جدید لفظی تراکیب ان کے یہاں بھی مل جاتی ہیں جنھیں کلاسیکی یا روایتی رچاؤ کے باوجود نئی یا اینٹی غزل کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔

یہاں رکھا تھا کل تابوت میرا　　در و دیوار میں اب تک نمی ہے

فارسی کی کوئی گردان ہے شاید یہ بھی　　یاد کرتے ہیں ترا نام، بھلادیتے ہیں

جب بھی آتا ہے کوئی عشق شماری کے لیے　　ہم رجسٹر میں ترا نام لکھا دیتے ہیں

ایک جگہ یہ بھی لکھا پایا کہ اینٹی یا نئی غزل میں جذبات کی برہنہ گفتاری کو اہمیت حاصل ہے۔ راقم یہ مانتا ہے کہ اینٹی غزل جذبات کی برہنہ گفتاری سے بھی آگے کی چیز ہے۔ اینٹی غزل میں بہت سے عوامل ایسے ہیں جنھیں طبع سلیم ایک نئے رجحان کے طور پر دیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی لیکن اسے غزل کے نام سے قبول بھی نہیں کرتی۔ جس طرح کلاسیکی غزل کے اشعار زبان زدِ عام ہوجاتے ہیں، اینٹی یا جدید یا نئی غزل کے اشعار میں بہت کم یہ صفت دیکھی گئی ہے۔
اینٹی غزل کے بعد بھی کچھ شعراء نے اپنی تجربہ پسند طبیعت کو راہ دکھانا مناسب سمجھا جس کے نتیجے میں اردو غزل میں میٹا غزل، فری غزل اور انگلش غزل جیسی اصطلاحات بھی زیرِ بحث آئیں۔ چوں کہ اردو غزل اپنی روایتی سرپرست عربی اور فارسی زبانوں کے زیرِ سایہ عاطفت پروان چڑھی تھی اس لیے وہ ان زبانوں کی مرہون منت تو تھی لیکن نئے تجربوں کے لیے اس نے ان دو زبانوں کو چھوڑ کر نئی زبانوں سے درس حاصل کرنا مناسب سمجھا اور مغربی ادب کے زیرِ اثر تجربے کیے۔ لیکن یہ سخت گرمی میں ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا ثابت ہوئے۔ نئے تجربات میں شعراء کی جانب سے ثابت قدمی اور تواتر و تسلسل کا شدید فقدان رہا۔
مغربی ادب نے بھی اردو غزل کے تجربے کیے جس کے نتیجے میں فائلس ویب (Phyllis Webb) نے ۱۹۸۴ میں 'واٹر اینڈ لائٹ: غزلز اینڈ اینٹی غزلز' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کا موضوع غزل اور اینٹی غزل تھا۔ یہ کتاب انگریزی غزلوں اور اینٹی

غزلوں کا مجموعہ تھی جو آج کل امیزون پر بھی دستیاب ہے۔ اس کے علاوہ مراٹھی زبان میں بھی مرحوم سریش بھٹ نے اردو غزل کے شانہ بہ شانہ مراٹھی میں بھی غزل کہی اور مراٹھی شاعری کو غزل کا قالب پہنایا۔لیکن ہم یہاں انگریزی اور مراٹھی غزل کی مثالوں سے صرف نظر کرتے ہیں۔

اینٹی غزل کا رجحان اپنے اندر کافی امکانات رکھتا ہے، اس میں کوئی دورائے نہیں لیکن اسے اینٹی غزل نہ کہا جائے اور اسے غزل مخالف رویہ نہ سمجھا جائے تب کہیں جا کر ہم اسے محض نئی یا جدید غزل کے زیرِ عنوان فروغ دے پائیں گے۔ ورنہ جتنی غزل مخالف تحریکیں اور رجحانات وجود میں آئے، ان کے زیرِ سایہ امکانات کے جگنو زیادہ دیر پرورش نہیں پاسکے۔

❀❀

خورشید ربانی ❁

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C. Latifabad, Hyderabad.

اردو ناول میں اسلامی شعائر کی عکاسی

اردو ناول کی ابتدا جس خطے میں ہوئی، وہاں اسلام ایک اہم مذہب کی صورت میں کئی صدیوں سے موجود تھا۔اس لیے اردو ناول میں اسلامی شعائر کا ظہور کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ظاہر ہے تخلیق کار جس علاقے میں رہتا ہے،جس زمانے میں ہوتا ہے وہ اپنے آس پاس کا ماحول،تاریخ،تہذیب وثقافت اور اس سماج کو اپنی تخلیق میں پیش کرتا ہے۔اسی طرح اس عہد اور اس سماج میں موجود مذہبی شعائر بھی اس کی تخلیق کا حصہ بنتے ہیں۔اردو ناول میں ایک خاص رجحان اسلامی تاریخ کی عکاسی ہے۔اس لیے جب اسلامی تاریخ کو بیان کیا جارہا ہوگا تو اسلامی شعائر کا تذکرہ بھی ضرور ہوگا۔اردو ناول میں اسلامی شعائر کے تذکرے کی روایت ناول کے آغاز کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔اس کے اولین نمونے اردو کے پہلے ناول سے رواج پاتے ہیں اور پھر یہ روایت بیش وکم دیگر ناولوں تک پھیلتی چلی جاتی ہے۔

اردو ناولوں میں اسلامی رسومات اور اخلاقیات کو کثرت سے پیش کیا جاتا ہے، جو معاشرے کے ثقافتی اور مذہبی تانے بانے کی عکاسی کرتے ہیں جس میں یہ ناول مرتب کیے گئے ہیں۔سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

> اردو ادب، اسلامی روایات سے گہرا متاثر ہونے کی وجہ سے، اکثر مذہبی طریقوں اور اخلاقی تحفظات کی باریکیوں کو تلاش کرتا ہے۔ بہت سے اردو ناولوں میں ایسے کرداروں کو دکھایا گیا ہے جو روزانہ کی نماز اور عبادت کی دیگر اقسام میں مشغول ہوتے ہیں۔ دعا کا عمل اکثر کسی کردار کی تقویٰ، ایمان کے ساتھ جدوجہد، یا روحانی عکاسی کے لمحات کو اجاگر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ رمضان کے مقدس مہینے اور روزے کی مشق (صوم) کو اکثر اردو ناولوں میں دکھایا گیا ہے۔ مصنفین روزے کے روحانی اور اخلاقی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ خاندان اور دوستوں کے ساتھ افطاری کے اجتماعی پہلوؤں کو بھی تلاش کر سکتے ہیں۔(۱)

کچھ ناولوں میں مکہ کی زیارت (حج) اور کرداروں کی زندگی میں اس کی اہمیت کے ارد گرد کی داستانیں شامل ہیں۔ حج کے دوران کرداروں کے تجربات اور تبدیلیوں کو اسلامی اخلاقیات کے تناظر میں تلاش کیا گیا ہے۔اردو ناولوں میں اکثر اسلامی اصولوں کے مطابق خاندانی اقدار اور سماجی اخلاقیات کی اہمیت پر زور دیا جاتا ہے۔ بزرگوں کا احترام، خاندانی تعلقات کو برقرار رکھنا، اور سماجی ذمہ

❁ شورکوٹ، ڈیرہ اسماعیل خان، فون: ۰۳۳۳-۵۲۸۶۷۹۰

داریوں کو پورا کرنا عام موضوعات ہیں۔

ناولوں میں اکثر اسلامی تہواروں جیسے عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی تقریبات کو شامل کیا جاتا ہے۔ ان تقریبات کے مسرت اور اجتماعی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ صدقہ اور قربانی سے متعلق اخلاقی تحفظات کو بیانیہ میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ حلال (جائز) اور حرام (حرام) کا تصور اکثر کرداروں کو درپیش اخلاقی مخمصوں میں بُنا جاتا ہے۔ ناول یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ کس طرح کردار اپنی ذاتی اور پیشہ ورانہ زندگیوں میں اخلاقی انتخاب کو مباح اور حرام اعمال کے اسلامی اصولوں پر غور کرتے ہیں۔ صباحت قمر بیان کرتی ہیں:

> مرد اور عورت دونوں کے لیے عاجزی اور لباس کے ضابطے (حجاب) پر اسلامی زور کو اردو ناولوں میں کبھی کبھی خطاب کیا جاتا ہے۔ کردار ساجی توقعات، ثقافتی اصولوں، اور لباس اور ظاہری شکل سے متعلق ذاتی اعتقادات سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ صدقہ (زکوٰۃ) دینے کا رواج اکثر اردو ناولوں میں دکھایا گیا ہے، جو ضرورت مندوں کی مدد کرنے کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ کردار فرد اور معاشرے پر اس طرح کے اعمال کے اثرات کو تلاش کرتے ہوئے احسان اور خیراتی کاموں میں مشغول ہو سکتے ہیں۔[۲]

کچھ ناولوں میں اسلامی تعلیم اور علم کے حصول کی تلاش کی گئی ہے، ان کرداروں کی تصویر کشی کی گئی ہے جو قرآن، حدیث اور دیگر مذہبی متون کے بارے میں اپنی سمجھ کو گہرا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ توکل کا تصور، یا اللہ پر بھروسہ، اردو ناولوں میں ایک بار بار چلنے والا موضوع ہے۔ کرداروں کو چیلنجز اور غیر یقینی صورتحال کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، اور ان کے سفر میں اکثر ایمان پر بھروسا اور فضلِ الٰہی شامل ہوتا ہے۔

کچھ اردو ناول اسلامی فقہ کی پیچیدگیوں کو تلاش کرتے ہیں، اس بات کی کھوج کرتے ہیں کہ کردار اسلامی قانون کے دائرہ کار میں قانونی اور اخلاقی مخمصوں کو کیسے حل کرتے ہیں۔ اس میں خاندانی قانون، کاروباری لین دین، اور ذاتی طرزِ عمل سے متعلق مسائل شامل ہو سکتے ہیں۔ احسان کا تصور، یا فضیلت اور احسان، ایک بنیادی اسلامی قدر ہے۔ ناولوں میں ایسے کرداروں کو دکھایا جا سکتا ہے جو اپنی ذاتی اور پیشہ ورانہ زندگیوں میں فضیلت کے لیے کوشاں ہوں، جو احسان اور ہمدردی کے اصولوں کو مجسم کر رہے ہوں۔ اردو ناولوں میں اکثر ایسے کرداروں کو پیش کیا جاتا ہے جو مشکلات اور چیلنجوں کا سامنا کرتے ہیں، صبر اور استقامت کے بارے میں اسلامی تعلیمات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بیانیہ اس بات پر روشنی ڈال سکتا ہے کہ کس طرح کردار مشکل وقت میں اپنے ایمان میں طاقت پاتے ہیں۔

کچھ اردو ناول صوفی روایات پر مبنی اسلام کی صوفیانہ جہتوں کو تلاش کرتے ہیں۔ کردار الٰہی کے ساتھ گہرا تعلق تلاش کرنے اور محبت اور عقیدت کی تبدیلی کی طاقت کا تجربہ کرتے ہوئے، روحانی سفر کا آغاز کر سکتے ہیں۔ اردو ناولوں میں توبہ اور فدیہ کا موضوع عام ہے۔ توبہ کے تصور کے بارے میں اسلامی تعلیمات کے ساتھ ہم آہنگی میں کردار ماضی کی غلطیوں اور گناہوں سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ اسلامی فن اور خطاطی کی تعریف کو بعض اوقات ناولوں میں شامل کیا جاتا ہے، جو اسلام کے ثقافتی اور جمالیاتی پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ کردار فنکارانہ اظہار کے ساتھ مشغول ہو سکتے ہیں جو اسلامی روایات سے متاثر ہوتے ہیں۔ محمد احسن فاروقی بیان کرتے ہیں:

اردو کے کچھ ناول اسلام کے فلسفیانہ اور اخلاقی جہتوں کو بیان کرتے ہیں۔کردار اسلامی نقطہ نظر سے وجود کی نوعیت، اخلاقیات اور زندگی کے مقصد کے بارے میں غور وفکر اور مکالمے میں مشغول ہو سکتے ہیں۔ ناول اکثر ثقافتی روایات اور اسلامی اقدار کے سنگم کو تلاش کرتے ہیں۔ کردار مقامی رسم ورواج اور اسلام کے اصولوں کے درمیان توازن قائم کر سکتے ہیں، جو ثقافتی شناخت کی متحرک نوعیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ دنیا بھر کے ادب میں ایک بڑھتا ہوا موضوع، بشمول اردو ناول، اسلامی ماحولیاتی اخلاقیات پر غور کرنا ہے۔ کردار ماحولیاتی تحفظ اور ذمہ داری کے مسائل سے نمٹ سکتے ہیں، جو زمین کے احترام کے بارے میں اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ کچھ ناول اقتصادی اخلاقیات کو اسلامی نقطہ نظر سے مخاطب کرتے ہیں، منصفانہ تجارت، اخلاقی کاروباری طریقوں اور مالیاتی لین دین میں سود کی ممانعت جیسے تصورات کی کھوج کرتے ہیں۔ (۳)

اردو ناول کی بنیاد رکھنے والے ڈپٹی نذیر احمد نے اصلاح معاشرہ کو سامنے رکھ کر ناول لکھے۔ وہ چوں کہ خود ایک شریعت اسلامی کے پابند مسلمان ادیب تھے اور اس سلسلہ میں شرعی علوم بھی حاصل کر رکھے تھے۔اس لیے اردو کے اولین ناول سے ہی اسلامی شعائر اس کا حصہ بن گئے۔ درس وتدریس بھی اسلامی شعائر سے جڑے اعمال میں سے ہے اور اسے عبادت کا درجہ بھی حاصل ہے۔ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے پہلے ناول ''مرأۃ العروس'' میں خواتین کی تعلیم پر توجہ مرکوز رکھی ہے اور ایک تعلیم یافتہ اور سگھڑ خاتون کو کامیاب خاتون بنا کر پیش کیا ہے۔ ناول کی ابتدا ہی اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی طرف توجہ مبذول کراتی ہے کہ ''پڑھ اپنے رب کے نام سے'' (سورۂ علق، آیت:۱) پڑھنے کی اس تاکید کے ساتھ درجنوں آیات اور احادیث میں علم کی ضرورت واہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے:

> ہم نے تم ہی میں سے ایک رسولؐ بھیجے ہیں جو تم کو ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کے سناتے اور تمھیں پاک بناتے اور کتاب یعنی قرآن اور دانائی سکھاتے ہیں اور ایسی باتیں بتاتے ہیں جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔ (۴)

حضور اکرمؐ کی حدیث ہے کہ ''علم حاصل کرو چاہے تمھیں چین بھی جانا پڑے''اسی طرح ایک روایت یہ بھی ہے کہ جنگ بدر کے موقع پر آپؐ ہر اس قیدی کو رہا فرما دیتے جو مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتا۔ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو علم کے حصول کے لیے یہ دعا بھی مرحمت فرمادی کہ ''اے اللہ میرے علم میں اضافہ فرما''۔ (۵)

خدا اور رسولِ اکرمؐ کے ان ارشادات سے علم کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔علم کے حصول کے اس حکم میں قرآن پاک پڑھنے اور حفظ کرنے تک ہی محدود نہیں، اس میں دنیاوی علوم کا حصول بھی شامل جو سماجی اور معاشرتی ضرورت ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد چوں کہ دینی علوم سے بہرہ مند تھے، اس لیے انھوں اپنے ناولوں کے ذریعے اسلامی احکامات اور اسلامی طرز حیات کی ترویج کی کوشش کی۔ ''مراۃ العروس'' کے آغاز میں وہ خواتین کو علم سیکھنے کی طرف راغب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مصیبت کی بات یہ ہے کہ اکثر عورتوں کو لکھانے پڑھانے کو عیب اور گناہ خیال کرتے ہیں۔ان کو

خدشہ ہے کہ ایسا نہ ہو لکھنے پڑھنے سے عورتوں کی چار آنکھیں ہو جائیں۔لگیں غیر مردوں سے خط وکتابت کرنے اور خدانخواستہ کل کلاں کو ان کی پاک دامنی اور پردہ داری میں کسی طرح فتور واقع ہو۔یہ صرف شیطانی وسوسے ہیں اور ملک کی خصوصاً عورتوں کی بدقسمتی لوگوں کو بہکا اور بھڑکا رہی ہے۔اول تو ہم ایک ذری سی بات یہی پوچھتے ہیں کہ علم انسان کی اصلاح کرتا ہے یا الناس کو بگاڑتا ہے اور خرابی کے لچھن سکھاتا ہے۔اگر بگاڑتا ہے تو مردوں کو بھی پڑھنے لکھنے کی مناہی ہونی چاہیے۔(۶)

علم کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ڈپٹی نذیر احمد نے جھوٹ اور غیبت کا ذکر بھی کیا ہے:

ہم تم سے سچ کہتے ہیں کہ جو شخص علم کو بدنام کرتا ہے، آسمان پر تھوکتا اور چاند پر خاک ڈالتا ہے۔بے شک بعض برے لوگوں نے بری کتابیں بھی دنیا میں پھیلا رکھی ہیں۔ اردو میں اس قسم کی کتابیں بہت کم ہیں اور جو ہیں سلسلۂ درس سے خارج ہیں اور ان کا پڑھنا اور سننا کیا مرد کیا عورت، سب ہی کے حق میں زبوں ہے،لیکن اس خیال سے کہ آنکھ بری جگہ بھی پڑسکتی ہے یا زبان سے بعض نالائق کوسنے،جھوٹ بولتے ہیں،گالیاں بکتے بلاضرورت قسمیں کھاتے یالوگوں کے پیٹھ پیچھے ان کی بدیاں روتے ہیں جس کو غیبت کہتے ہیں نہ آنکھیں پھوڑی جاتی ہیں اور نہ زبان کاٹی جاتی ہے۔تو صرف علم نے کیا قصور کیا ہے کہ ایک لغو اور بے اصل احتمال کی بنیاد پر عورتوں کو اس کے بے انتہا دینی اور دنیاوی فائدوں سے محروم رکھا جائے؟(۷)

ڈپٹی نذیر احمد ایک اور اسلامی شعائر یعنی شب برات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ایک کردار کی زبانی وہ لکھتے ہیں:

اصغری؛اماں جان؛مسلمانوں میں شب برات کی کچھ رسم سی پڑ گئی ہے ورنہ دین میں تو اس کی کچھ اصل نہیں ہے۔ہمارے ابا کو شب برات کی ایسی چڑ ہے کہ دوسروں کے یہاں سے آیا ہوا میٹھا نہ آپ کھائیں اور نہ ہم کو کھانے دیں۔اول تو ابا شہر میں جم ہی جم ہوتے ہیں لیکن جس برس آپا کا بیاہ ہوا ان کی شب برات یہیں ہوئی تھی۔اماں بہتیرا لڑیں جھگڑیں مگر ابا نے کہا میں تو یہ بدعت اپنے گھر میں ہونے دینے کا نہیں اور یوں خرچ کو کہو تو مجھ سے دس کی جگہ بیس لو اور غریبوں کو دو۔پر شب برات کے نام سے تو میں ایک پھوٹ کوڑی دینے والا نہیں۔(۸)

موت، برحق ہے اور ہر ذی روح نے زرقِ خاک ہونا ہے۔مرنے کے بعد اسلام نے میت کو دفنانے اور اس کا جنازہ ادا کرنے کا حکم دیا۔کفن دینا،نماز جنازہ پڑھنا اور مرحوم کے پسماندگان کو تسلی دینا،مسلمان کی اخلاقی اور شرعی ذمہ داری ہے۔جس طرح مرد نمازِ جنازہ میں شریک ہوتے ہیں اور میت کو کفنانے کے بعد قبرستان میں دفن کرتے ہیں۔مرنے والے کے عزیزوں سے دکھ اور افسوس کا ظہار کرتے ہیں۔اسی طرح خواتین بھی مرحوم کے اہلِ خانہ سے اظہارِ ہمدردی کو جاتی ہیں۔موت پر صبر کرنے کا حکم بھی اللہ تعالی نے دیا

ہے۔اس ضمن میں سماج میں کچھ بری باتیں بھی رواج پا گئی ہیں۔اکثر مرنے والے کے پسماندگان کو اس کی موت کا سبب کسی وہم یا کسی بری نگاہ یا آسیب وغیرہ کا اثر بتا کر ان کے دکھ میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں:

جب محمد عادل مرا تو عورتوں نے اصغری کے ایمان میں خلل ڈالنا شروع کر دیا۔کوئی کہتی کو گھ کا خلل ہے۔قہر علی شاہ سے علاج کراو۔کوئی کہتی دودھ پر نظر ہے۔چوراہے میں اتار رکھو۔کوئی کہتی مسان کا دکھ ہے۔رمضان شاہ سے گڑانت کراؤ۔کوئی کہتی مکان اچھا نہیں۔میر علم سے کلواؤ۔کوئی کہتی سفر میں آئی گئی ہو کوئی چڑیل لپٹ گئی ہے، کچھو چھے چلو۔گنڈے اور تعویذ عمل ٹونے اور ٹوٹکے تو دنیا جہان کے لوگ بتاتے تھے۔لیکن واہ ری اصغری، یوں اوپر تلے دو بچے مرے لیکن سدا خدا پر شاکر رہی۔(۹)

اسی طرح کی کاوش ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے دیگر ناولوں میں بھی کی ہے۔''بنات النعش'' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

محمودہ! ہاں، بس یہی غلطی ہے۔یہ ماما اس اوقات کی نہیں ہے۔غریب تو ہے مگر عزت دار ہے۔بے شک، آپ کے نزدیک دولت ہی عزت ہے اور میرے نزدیک بلکہ خدا و رسولؐ کے نزدیک دنیا کے عقل مندوں کے نزدیک نیکی بڑی عزت ہے۔حسن آرا! بھلا میں بھی دیانت بیگم کی کچھ نیکیاں سنوں۔کون سا لنگر تقسیم کرتی ہیں؟ کوئی سرائے مسافروں کے آرام کے لیے بنوادی؟ جنگل میں پیاسوں کے واسطے کوئی کنواں کھدوایا ہے؟ کسی بیوہ کی تنخواہ کر رکھی ہے؟ مسجد کے مسافروں کو کھانا مقرر ہے؟ محمودہ! کیا بس یہی نیکیاں ہیں؟ وہ نیکیاں ہیں جو دولت مندوں کے حصے میں ہیں۔اب میں دیانت کی نیکیاں گنواؤں۔دیکھیے، اس قدر تو غریب ہے کہ ماما گیری کرتی ہے مگر اتنی بڑی ایمان دار ہے کہ لاکھ کو خاک سمجھتی ہے۔چھ چپاتیاں صبح چھ شام اس کو یہاں سے ملتی ہیں۔پانچ کبھی چار آپ کھاتی اور ڈیڑھ ایک ضرور خدا کے نام مسجد دے آتی ہے۔اس کی ایک چپاتی آپ کے لنگر سے کہیں زیادہ ہے۔دیکھئے یہ عمر ہے کہ کانٹا تک نہیں سوجھتا۔آپ جانتی ہیں کہ ان یہ بچہ کھول کے کیوں بیٹھی ہیں؟ ہمسائی کے بچوں کے کپڑوں میں پیوند لگائیں گی۔دونوں وقت مفت میں چھ سات گھروں کا سودا لا دیا کرتی ہیں۔ہمسایوں میں کوئی بیمار ہو، خدا واسطے کو اپنے ہاتھوں قارورہ حکیم کے یہاں لے جانا، عطار کی دکان سے نسخہ بندھوا لانا، چھان بنا کر پلانا اور دن میں دس دس مرتبہ جا کر پوچھنا۔جھوٹ کبھی نہیں بولتی، چغلی کسی کی نہیں کھاتی۔پیٹھ پیچھے کسی کو برا نہیں کہتی۔کسی کے کام عذر نہیں۔سب کو ایک صلاح، ایک نصیحت۔(۱۰)

ان کی اس خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رفعت اقبال خان لکھتے ہیں:

نذیر احمد (اور گویا کہ اردو) کی ناول نگاری کا آغاز ان اصولوں کی سچائی ثابت کرنے کے لیے ہو جو

مذہبی اخلاقیات نے گھر اور خاندان کی بنیادی اکائی کے تحفظ کے لیے قائم کیے ہیں۔ گھر اور عورت لازم وملزوم ہیں اور مشرقی دینی روایات پر عامل عورت ہی مثالی صفات کی حامل ہوسکتی ہے۔ علم اور درست تربیت سے محروم کرداروں کی زندگی اپنے اور دوسروں کے لیے اجیرن ہوجاتی ہے۔ 'مرۃ العروس'، 'بنات النعش' اور کسی حد تک 'فسانہ مبتلا' جیسے ناولوں سے نذیر احمد کی یہ سوچ ابھرتی ہے کہ تعلیم یافتہ، سلیقہ مند اور سگھڑ عورت، گھر کے سکون اور خوب صورتی کا باعث ہوتی ہے۔ معاشرتی اصلاح اور مسلم خواتین کی فلاح کی آرزو کے تحت انھوں نے قصہ گوئی کے امکانات کا جائزہ لیا اور میر امن کی محاوراتی زبان کی روایت سے منسلک ہو کر ناول نگاری کے میدان میں اولیت کا سہرا باندھ لیا۔[۱۱]

ڈپٹی نذیر احمد کے بعد عبدالحلیم شرر کے معروف ناول ''فردوسِ بریں'' میں بھی اسلامی شعائر کا ذکر ملتا ہے۔ اس ناول کا نام بھی اسلامی شعائر میں سے ہے۔ فردوس بریں، جنت کو کہتے ہیں جو مرنے کے بعد نیک لوگوں کے رہنے کی جگہ ہے۔ ''فردوس بریں'' کے ابتدا ہی سے اسلامی شعائر میں سے مسجد، نماز، خانقاہ اور شیخ تذکرہ اس طرح سامنے آتا ہے:

حسین نے یہ سن کر شکرگزاری کے طریقے سے سر اٹھایا، شیخ کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور ان کے ساتھ جا کے نماز میں شریک ہوا۔ نماز کے بعد شیخ شریف علی وجودی اسے اپنی خانقاہ میں لے گئے جو شہر سے کچھ فاصلے پر ایک غیر آباد مقام پر تھی۔ حسین کو یہ خیال کر کے تعجب ہوا کہ مسجد ثمائین کو کیا تخصیص ہے کہ شیخ وہاں فجر کی نماز ادا کرنے کو گئے تھے۔ اس کا راز دریافت کرنے کے لیے اس نے ادب کے ساتھ پوچھا کہ حضرت ہر روز نماز کے لیے مسجد میں تشریف لے جاتے ہیں۔ شیخ! (بے پرواہی سے) نہیں، صرف آج چلا گیا تھا۔[۱۲]

شیخ اور مرشد کا تصور، اسلام میں تصوف کے راستے داخل ہوا۔ تصوف سے مراد تزکیہ نفس ہے یعنی روح کی پاکیزگی۔ حدیث میں اس کے لیے احسان کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ تصوف کی راہ پر چلنے والے کو صوفی کہتے ہیں اور اس کی جمع صوفیا ہے۔ یہی صوفی جب دیگر مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے تو اسے شیخ اور مرشد کہا جاتا ہے۔ اس اصطلاح کا ذکر ''فردوسِ بریں'' میں کئی بار آیا ہے جسے شیخ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس شیخ کو ایک مرید، ایک طالب علم جو تصوف کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کی رہنمائی کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے:

حسین! تو میری خانقاہ میں اور خاص میری صحبت میں رہا کر اور جس قدر زیادہ خدمت کرے گا اور جس مستعدی سے بے عذر و حجت میرے احکام کی جو دراصل احکام الٰہی ہیں، تعمیل کرے گا، اسی قدر جلد کامیاب ہوگا۔ مگر خوب سمجھ لے کہ ابھی تیرا ظرف اور تیرا دل اس قابل نہیں کہ فتوحاتِ ربانی اور انقلابِ قدرت کے اسباب و علل کو سمجھ سکے۔ موسیٰ و خضرؑ کا قصہ ہر وقت پیشِ نظر رکھ اور یقین کر لے کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے۔ نتائج ہمیشہ باطن میں مخفی ہوتے ہیں۔ ظاہر پرست رموزِ قدرت کو نہیں سمجھ

سکتے۔سزا اور جزا روح کے لیے ہے جو باطن پر متصرف رہتی ہے اور ہمیشہ دل کے اندر اور نیت پر حکمران ہے۔(۱۳)

''فردوسِ بریں'' چوں کہ فرقہ باطنیہ کے حوالے سے ہے، اس لیے اس میں زیادہ اس فرقے کے معمولات کا ذکر زیادہ ہے۔دیگر بھی کئی حوالے ہیں لیکن ایک اور اسلامی شعیر کا ذکر کر کے دیگر ناولوں کا جائزہ لیتے ہیں۔''فردوسِ بریں'' میں اسلام کی بنیادی شناخت یعنی سلام کا ذکر بھی ملتا ہے۔سلام کرنا سنت ہے اور اس کا جواب دینا واجب۔یعنی دو اسلامی بھائی آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو سلام پیش کرتے ہیں۔اس کے لیے اسلام میں با قاعدہ قاعدے اور اصول موضع کیے گئے ہیں۔''فردوسِ بریں'' میں ہے:

حسین! خداوندا میں خواب دیکھتا ہوں یا بیدار ہوں۔اور دیکھیے طیور کے نغموں سے بھی وہی آواز نکلتی ہے۔السلام علیکم فادخلو ہا خالدین۔بلغان خاتون! اس کے کیا معنی ہیں؟۔حسین!اللہ جل شانہ نے قرآن پاک میں وعدہ کیا ہے کہ جنت میں لوگوں کا خیر مقدم ادا کیا جائے گا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پر سلام ہو۔پاک ہو گئے تم لوگ۔لہٰذا ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل ہو جاؤ۔(۱۴)

شرر نے اس کے علاوہ بھی ناول لکھے ہیں اور ان میں بھی اسلامی تاریخ اور اسلامی شعائر کو پیش کیا ہے۔ان کے دوسرے ناولوں میں 'ملک العزیز ورجینا'، 'حسن اور انجلینا'، 'یوسف اور نجمہ' اور 'فلور فلوریڈا' شامل ہیں جو شرر نے مسلمانوں میں مذہبی جوش پیدا کرنے کی غرض سے لکھے۔ان معروف ناولوں کے جس ناول نے اردو ناول کی تاریخ میں سب سے زیادہ عزت و شہرت کمائی وہ مرزا رُسوا کا ''امراؤ جان ادا'' ہے۔اس ناول میں بھی جزوی طور پر اسلامی شعائر کا ذکر ملتا ہے۔مثلاً نماز اور عید کا ذکر اس طرح آتا ہے:

عید کے دن تو میں نیا جوڑا پہنوں گی۔ہاں میں تو نیا پہنوں گی۔ہاں میں میں تو نیا پہنوں گی۔جب اماں کھانا پکا چکیں۔ مجھے آواز دی۔ میں گئی روٹی کی ٹوکری اور سالن کی پتیلی اٹھالائی۔دسترخوان بچھا،اماں نے کھانا لگایا۔سب نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔اب نے عشا کی نماز پڑھی،سو رہے۔صبح کو تڑکے ابا اٹھے،نماز پڑھی اسی وقت میں کھٹرک سے اٹھ بیٹھی۔ پھر فرمائشیں شروع ہوئیں۔'میرے ابا آج نہ بھولنا گڑیاں ضرور لیتے آنا۔شام کو بہت سارے امرود اور نارنگیاں لانا۔'ابا صبح کی نماز پڑھ کے وظیفہ پڑھتے ہوئے کوٹھے پر چڑھ جاتے تھے۔کبوتروں کو کھول کے دانہ دیتے تھے۔ایک دو ہوا میں اڑاتے تھے،اتنے میں اماں جھاڑو سے فراغت کر کے کھانا تیار کر لیتی تھیں۔(۱۵)

اسی طرح مدرسے کے مولوی کا نقشہ کھینچتے ہوئے، اسلامی شعائر بھی تذکرے میں آ گئے۔درج ذیل میں دیکھئے کہ داڑھی،تسبیح،سجدہ گاہ،کس کا ذکر کس انداز میں ہوا ہے:

خانم جان کی نوچیوں کو صرف ناچ گانے کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی بلکہ لکھنے پڑھنے کے لیے مکتب بھی تھا۔مولوی صاحب نوکر تھے۔حسبِ دستور میں بھی مکتب بھیجی گئی۔مولوی صاحب کا نورانی چہرہ،سفید کترواں داڑھی،صوفیانہ لباس،ہاتھ میں عمدہ فیروزے کی اور عقیق کی انگوٹھیاں،خاک پاک کی

تسبیح، اس میں سجدہ گاہ بندھی ہوئی ہر دتی کی جریب چاندی کی شام بہت ہی نفیس، ڈیڑھ خمہ حقہ، افیون کی ڈبی، پیالی الغرض کہ جملہ تبرکات آج تک نظر میں ہیں۔[۱۶]

''امراؤ جان ادا'' میں ماتم داری، نوحہ خوانی، چہلم اور دوسری مذہبی رسومات کا ذکر بھی ہے۔ کربلا کا ذکر بھی ہے اور شہدا کربلا کی یاد بھی۔ ایک موقع پر رسوا نے امراؤ کی زبان سے کربلا کا ذکر یوں کرایا ہے:

جی ہاں مولا نے سب مرادیں پوری کیں۔ اب یہ تمنا ہے کہ مجھے کربلا پھر بلا بھیجیں، میری مٹی عزیز ہوجائے۔ مرزا صاحب! میں اس ارادے سے گئی تھی کہ پھر کے نہ آؤں گی۔ مگر خدا جانے کیا ہوا تھا کہ لکھنؤ سر پر سوار ہوگیا۔ مگر اب کی اگر خدا نے چاہا اور جانا ہوگیا تو پھر نہ آؤں گی۔[۱۷]

''امراؤ جان ادا'' میں نکاح کا ذکر بھی ہے۔ نکاح شریعت محمدی میں سنتِ رسولؐ کے طور پر رائج ہے۔ خدا کا حکم بھی یہی ہے کہ نکاح کیا جائے۔ بے نکاح اختلاط ممنوع ہی نہیں گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔ رسوا لکھتے ہیں:

اگرچہ سچا واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب سے اور مجھ سے نکاح نہ تھا۔ مگر عدالتوں میں اکثر سچی بات کے لیے جھوٹے گواہ پیش کرنا ہوتے ہیں۔ فریقِ ثانی کی طرف سے بالکل جھوٹا دعویٰ تھا مگر مقدمہ اس سلیقے سے بنایا گیا تھا کہ کوئی صورت مفر کی نہ تھی۔ نکاح کے ثبوت میں دو مولوی پیش کیے گئے۔ جن کے ماتھوں پر گھٹے پڑے ہوئے بڑے بڑے عمامے سر پر عبائیں زیب دوش، ہاتھوں میں کنٹھے، پاؤں میں کفشیں۔ بات بات میں قال اللہ قال رسول ان کی صورت دیکھ کے حاکم عدالت کیا کسی نیک نیت آدمی کو کذب و دروغ کا شبہ بھی نہیں ہوسکتا۔ ان میں سے ایک بزرگ ناکح کے وکیل بنے اور ایک منکوحہ کے۔ مگر پھر حق حق ہے اور ناحق ناحق۔ جرح میں بگڑ گئے اور انھیں کی گواہی کی وجہ سے نواب اپیل ہار گئے۔[۱۸]

ایمان، اعتقاد، رمضان، محرم، تعزیہ داری اور گناہوں کا ذکر بھی ''امراؤ جان ادا'' میں موجود ہے۔ رسوا لکھتے ہیں:

اکبر علی کو تعزیہ داری سے عشق تھا۔ رمضان اور محرم میں وہ اس قدر نیک کام کرتے تھے جس سے ان کے سال بھر کے گناہوں کی تلافی ہو جاتی تھی۔ یہ صحیح ہو یا غلط، ان کا اعتقاد یہی تھا۔ رسوا! یہ معاملہ ایمان کا ہے، اس لیے مجھے اتنا کہہ لینے دیجیے کہ یہ اعتقاد صحیح نہیں ہے۔ امراؤ! یہ میرے نزدیک بھی ایسا ہی ہے۔ رسوا! عقل مندوں نے گناہ کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک وہ جن کا اثر اپنی ہی ذات تک رہتا ہے اور دوسرے وہ جن کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے۔ میری رائے ناقص میں پہلی قسم کے گناہ صغیرہ ہیں اور دوسری قسم کے گناہ کبیرہ ہیں (اگرچہ اور لوگوں کی رائے اس کے خلاف ہو) جن گناہوں کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے ان کی بخشش وہی کرسکتے ہیں جن اس کا اثر پڑا ہو۔[۱۹]

''آگ کا دریا'' قراۃ العین حیدر کا وہ ناول ہے جسے اردو ناول کی تاریخ میں سب سے بڑا ناول کہا جاتا ہے۔ اس ناول میں

مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں کی عکاسی ملتی ہے۔ اسلامی شعائر کا ذکر بھی ہے۔ تصوف اور صوفیا کے حوالے سے ایک جگہ لکھتی ہیں:

ملامتیوں کے قصے بھی سن رکھے تھے۔ گنگا کے کنارے کنارے آم کے درختوں میں چھپی ہوئی خانقاہوں میں اس نے ان اللہ کے بندوں کو دیکھا جو لاہوت سے ناسوت تک سارے فاصلے طے کر چکے تھے یا تصور شیخ میں گم بیٹھے تھے۔ نروان اور فنا کی تلاش میں اس نے یوگیوں اور صوفیوں دونوں کو مراقبے اور سادھی میں کھوئے ہوئے دیکھا۔ علم کا راستہ وہ طے کر رہا تھا مگر اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ یہ راستہ بل کھاتا جانے کتنی دور تک جاتا تھا، ابھی تو وہ پہاڑ کے دامن ہی میں پہنچا تھا۔ صوفیوں نے اسے اپنی اور بلایا۔ انھوں نے کہا: آخری حقیقت روشنی ہے۔ نور... نور ... نور جو نور نہیں اس کا وجود نہیں۔ چند اور درویشوں نے اسے بتایا: آخری حقیقت خیال ہے۔ خدا کے جلال و جمال اور کمال کے ذکر کی گونج اس نے ان کنجوں میں سنی۔ کیوں کہ یہ ہندوستان تھا۔ یہ فریدالدین عطارؒ، ہجویریؒ اور شیخ جلال الدین تبریزیؒ اور بہاؤالدین ذکریاؒ اور جلال الدین سرخ پوشؒ اور معین الدین چشتیؒ اور قطب الدین بختیار کاکیؒ کا ملک تھا اور کون بدبخت ہوگا جو اس ملک میں آکر بھی وہ نہ پاسکے جس کی اسے تلاش تھی۔(۲۰)

''آگ کا دریا'' میں ایک جگہ مسجد کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

اس کے دونوں لڑکے ماہر تعمیرات تھے اور گوڑ اور سنار گاؤں میں عمارتیں بنوانے میں مصروف تھے۔ گوڑ کی چھوٹا سونا مسجد اور گن منت مسجد کا نقشہ جمال نے تیار کیا تھا۔ جمال گوڑ کا میر عمارت تھا۔ بڑا سونا مسجد کی سبز اور نیلی اور سفید اور زرد اور نارنجی پچی کاری میں بنگال کے سارے رنگ سمیٹ لیے گئے۔ ان کے ستون، ان کی محرابیں اور گنبد خالص دیسی تھے۔ یہ عمارتیں بھی پال سین عہد کی تعمیرات کی روایت میں شامل ہوگئیں۔(۲۱)

اردو ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر کے ساتھ کا اگر کوئی ناول نگار ہے تو وہ عبداللہ حسین ہے۔ عبداللہ حسین کے ناول ''اداس نسلیں'' کو بھی وہی مقام حاصل ہے جو ''آگ کا دریا'' کو حاصل ہے۔ ان کے ناولوں میں بھی اسلامی شعائر کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے ناول ''باگھ'' کے جملے دیکھیں جن میں اللہ تعالیٰ اور قوانین اسلام کا ذکر آیا ہے:

''تو یہ کیا ہے؟'' اسد نے ہاتھ کے جھٹکے سے زنجیر کو ہلایا۔

''اگر سزا اور جزا اللہ کے ہاتھ میں ہے تو یہ سزا کس جرم کی ہے؟''

''بے وقوفی کے جرم کی۔'' خدا نے تمھیں اپنے دماغ پہ اختیار دیا ہے۔ مزاحمت تو سب سے زیادہ پتھر کے بت میں ہوتی ہے۔ مگر ہتھوڑے کی ضربوں سے آخر بت ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے۔ انسان کی برتری یہ ہے کہ اللہ نے اسے دماغ دیا ہے، عقل استعمال کرو۔ قانون کے کل پرزوں کی مدد کرو اور

خود بچ کر نکل جاؤ۔ اگر تم اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاؤ تو یہی تمھاری بے گناہی کا ثبوت ہوگا۔''

''آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔'' اسد نے کہا۔

''آپ کے خیال میں جو بچ کر نکلتا ہے وہ بے گناہ ہے اور جو جو مارا جاتا ہے وہ گنہ گار؟۔''[۲۲]

عبداللہ حسین کا ناول ''قید'' جہاں سماجی ظلم وستم کی داستان بیان کرتا ہے وہیں پیشہ ور پیروں کو بے نقاب بھی کرتا ہے جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزیاں کرتے چلے جاتے ہیں۔ ''قید'' ایسے ہی ایک پیر صاحب کا ذکر ہے۔ اس کے حجرے کا بیان دیکھیے:

جس جگہ پیر صاحب کی نشست تھی وہاں سب سے اعلیٰ درجے کا چھوٹا سا قالین بچھا تھا اور اوپر سبز مخمل کا گاؤ تکیہ دیوار کے ساتھ پڑا تھا۔ دائیں طرف کو سبز مخمل کی ہی جائے نماز بچھی تھی جس پر پیر صاحب کبھی کبھار استغراق کی حالت میں جا بیٹھتے گو انھیں نماز ادا کرتے ہوئے کبھی کسی نے نہ دیکھا تھا۔ جائے نماز کا ایک کونا ہر وقت الٹا رہتا تھا تا کہ خالی وقت میں اس کے اوپر شیطان سے کسی خباثت کے سرزد ہونے کا امکان نہ رہے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی تصویریں، اور ہاتھ سے لکھی قرآنی آیات، شیشے کے فریم شدہ چوکھٹوں میں دیواروں پر چاروں طرف لٹکی ہوئی تھیں۔[۲۳]

اسی ناول میں ایک فقیر کا ذکر بھی ہے جس کی دعا سے اولاد کا حصول اور ولایت ملتی تھی۔ اس ناول کا کردار چودھری برکت علی اولاد نرینہ کے لیے اس فقیر سے دعا کراتا ہے جس پر اسے اللہ تعالیٰ بیٹا عطا کرتا ہے۔ عبداللہ حسین لکھتے ہیں:

رمضان کے مبارک مہینے کی یکم تاریخ کو اللہ تعالیٰ نے فقیر کی دعا سے چودھری برکت علی کو اولاد نرینہ سے نوازا۔ اسی روز افطاری کے وقت پر انھوں نے ایک ایک دیگ چاولوں کی پکوا کر گاؤں میں تقسیم کی، باقی کی خوشیاں رمضان المبارک کے احترام میں عید کے موقع تک کے لیے اٹھا رکھیں۔ شکرانے کے طور پر بہر حال انھوں نے اسی وقت دو رکعت نفل ادا کر کے خدا سے وعدہ کیا کہ وہ تیس کے تیس روزے آٹھ پہرے اٹھائیں گے۔ مزید یہ کہ آج سے وہ پنج وقتی نماز کے علاوہ باقاعدگی سے تہجد گزار ہوں گے۔[۲۴]

شوکت صدیقی کا ناول ''خدا کی بستی'' بھی اردو کے اہم ترین میں سے ہے۔ اس ناول میں سماجی بے راہ روی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناول میں بھی جزوی طور اسلامی شعار کا تذکرہ ملتا ہے۔ مثال کے طور حشر یعنی روز قیامت کو ایک شعر میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

جاگنا ہے جاگ لے افلاک کے سائے تلے
حشر تک سوتا رہے گا خاک کے سائے تلے[۲۵]

شوکت صدیقی ایک جگہ مسجد کا ذکر اور ایمان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

ہر تقریر کا لب لباب یہی تھا کہ خان بہادر عوام کا مخلص رہنما، ایک سچا اور صالح مسلمان تھا۔ اس کے سینے میں ایمان کی حرارت اور غریبوں کی خدمت کا جذبہ موجزن تھا۔ وہ ان کے ووٹوں کا صحیح حقدار تھا۔ قریب قریب ہر مقرر نے 'نورانی مسجد' کی تعمیر کو خان بہادر کی گراں قدر خدمت اور ایمان افروز کارنامہ قرار دیا۔ انھوں ے خان بہادر کو عوام کا نمائندہ ثابت کرنے کے لیے فصاحت و بلاغت کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ خان بہادر کے پیسے وصول ہو گئے۔(۲۶)

ان کے علاوہ بھی کئی ناولوں میں اسلامی شعائر کا تذکرہ موجود ہے۔ اس روایت کی مضبوطی کا سبب لکھنے والوں کا مسلمان ہونا بھی ہے اور ایک مسلمان ملک کا سکونتی ہونا بھی۔ ایک ایسا ملک جو قائم ہی اسلام کے نام پر ہوا تھا۔ اس کے دانش ور اور ادیب اسلامی تعلیمات سے کیسے گریز کر سکتے تھے۔ ایک اور معروف ناول ''پریشر کُکر'' سے بھی ایک آدھ اقتباس درج کیا جاتا ہے جو اسلامی شعائر کا حامل ہے۔ اس ناول کے مصنف صدیق سالک ہیں۔ یہ ناول بھی اردو کے مقبول ناولوں میں شامل ہے:

کرموں کو لڑکے کی پیدائش کی تمنا تھی۔ ایک تو شادی کے پہلے پانچ سال تک اس کے گھر اولاد نہیں ہوئی تھی اور جب بالا آخر اللہ تعالیٰ نے ریشماں کی گود ہری بھی کی تو لڑکی سے۔ ذکیہ کی پیدائش سے اگر چہ کرموں ذاتی طور پر خوش تھا لیکن اکثر خاندان والے طرح طرح کی باتیں بنانے لگے تھے۔ لیکن کرموں نے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے اسے نر اولاد سے نواز ہے۔ اس نے خوش ہو کر اللہ کے نام پر دونوں مقامی خانقاہوں پر نذرانہ چڑھایا اور مسجد فنڈ میں دس روپے دیے۔ بعد میں ریشماں نے اسے بتایا کہ اس نے پانچ میل دور ''چپ شاہ'' کے مزار کی بھی منت مانی ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بیٹا دیا تو وہاں ایک بکرا اور ایک جھنڈا چڑھائے گی۔ اپنی آمد سے دو تین روز بعد کرموں یہ منت بھی پوری کر آیا۔(۲۷)

ایک اور جگہ حج، نماز اور دیگر شعائر اسلام کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

شیخ رفیق کئی دفعہ حج کر چکے تھے۔ انھوں نے چھوٹی سی داڑھی رکھی ہوئی تھی جس کے زیادہ تر بال سفید تھے۔ ان کا قد درمیانہ اور چہرہ نورانی تھا۔ وہ عموماً سفید شلوار کرتہ اور سفید ہی پگڑی باندھتے تھے۔ پگڑی کو کبھی کلف نہیں لگواتے تھے۔ اس لیے ان کی ململ کی پگڑی بھی ان کی شخصیت کی طرح ملائم تھی۔ وہ کچہری بازار میں اپنی وسیع دکان میں تخت پوش پر گدا بچھا کر اور گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھتے تھے۔ دن بھر ٹیلی فون سنتے، حقہ پیتے، ظہر اور عصر کی نماز ساتھ والی مسجد میں ادا کرتے اور مغرب سے پہلے پہلے گھر واپس آ جاتے۔ ان کے قابل اعتماد کارکن ان کے بعد بھی کام کرتے رہتے۔ شیخ صاحب کی کوٹھی امین پور بازار کے پیچھے عیدہ گاہ کے قریب واقع تھی۔(۲۸)

ان کے علاوہ بھی پریشر نگر میں روزے، زکواۃ، عشر، میلاد، خیرات، نکاح، عقد ثانی، جہاد سمیت کئی اسلامی تعلیمات کا ذکر موجود ہے۔نسیم حجازی کا نام اسلامی تاریخی ناول لکھنے والوں میں سرفہرست ہے۔انھوں نے اپنے ناولوں میں طارق بن زیاد اور صلاح الدین ایوبی جیسی عسکری شخصیات کو موضوع بنایا ہے اور اسلامی تاریخ کے تناظر میں ''آخری چٹان اور" تلوار ٹوٹ گئی ہے" جیسے ناول لکھے۔ یہ تکنیک ان کے دوسرے ناولوں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ایم اسلم اور خان آصف کے ناولوں میں بھی مذہبی ماحول اور اسلامی تاریخ نگاری کا بھی مضبوط رجحان پایا جاتا ہے۔ان کے ناول ''آخری چٹان'' کا یہ اقتباس دیکھیے:

مدینے سے کوئی ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی کی مسجد میں صبح کی نماز کے بعد شیخ احمد بن حسن قرآن وحدیث کا درس دے رہے تھے۔طاہر بن یوسف مسجد میں داخل ہوا اور شیخ کی طرف دیکھنے لگا۔طاہر کی عمر کوئی بائیس سال کے قریب تھی۔ اس کے دراز قد، سڈول جسم اور حسین چہرے میں غایت درجہ کی شوکت اور دل فریبی تھی۔نگاہوں میں عقاب کی سی بے باکی اس کی ذہانت کی آئینہ دار تھی۔احمد بن حسن نے سوال کیا! تیار ہو آئے۔'جی ہاں! میں امی جان سے رخصت ہو آیا ہوں'۔احمد بن حسن نے شاگردوں کو رخصت کیا اور اٹھ کر نوجوان کے ساتھ مسجد سے باہر نکل آئے۔مسجد کے دروازے سے باہر شیخ کا ایک نوکر گھوڑا لیے کھڑا تھا جو سفر کے ضروری سامان سے لیس تھا۔(۲۹)

نسیم حجازی کے ناول ''اور تلوار ٹوٹ گئی'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔یہ ناول سلطان ٹیپو شہید کی زندگی سے متعلق ہے:

بہن مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔اکبر خان کی کی آنکھوں میں آنسو جمع ہورہے تھے۔ ضرورت نے کہا! اکبر تمھیں یہ کہنے کی ضورت نہیں۔میری دعائیں ہر وقت تمھارے ساتھ ہیں'۔ منور کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا! بی بی جی مہمان کے لیے کھانا تیار ہے، لے آؤں؟ 'ہاں جلدی کرو!'۔اکبر خان نے کہا۔نہیں میں نے کھانا راستے میں کھالیا تھا۔آپ نے یونہی تکلیف کی۔' فرحت نے کہا! تھوڑا بہت کھالو۔نہیں بھابی جان میں تکلف نہیں کر رہا۔ میں واقعی کھا چکا ہوں۔اب عصر کی نماز کا وقت ہورہا ہے۔ میں ذرا مسجد سے ہو آؤں۔'بہت اچھا۔منور تم ان کے ساتھ جاؤ۔(۳۰)

نسیم حجازی کے ناول ''داستانِ مجاہد'' سے بھی ایک اقتباس دیکھیے:

وہ دشمنوں کی صفوں کو چیرتے اور روندتے ہوئے جارہے تھے۔اور دشمنوں کے گھوڑے اور ہاتھی ان کے بے پناہ حملوں کی تاب نہ لاکر آگے آگے بھاگ رہے تھے۔اس کے نوجوان بیٹے ان کے تعاقب میں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریاؤں میں گھوڑے ڈال رہے تھے۔وہ دشمن کے نرغے میں کئی بار اٹھ اٹھ کر گرتے ہیں اور بالآخر زخموں سے نڈھال ہو کر کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے خاموش ہوجاتے ہیں۔وہ دیکھ رہی تھی کہ جنت کی حوریں ان کے لیے شراب طہور کے جام لیے کھڑی

ہیں۔صابرہ نے اناللہ وانا الٰہ راجعون پڑھا اور سجدے میں سر رکھ کر دعا مانگی کہ اے زمین و آسمان کے مالک! جب مجاہدین کی مائیں تیری بارگاہ میں حاضر ہوں تو میں کسی سے پیچھے نہ رہوں۔ان بچوں کو اس قابل بنا کہ وہ اپنے آباواجداد کی روایات زندہ کرسکیں۔(۳۱)

نسیم حجازی کے ساتھ ایک اور اسلامی تاریخی ناول نگار عنایت اللہ کا نام بھی اہمیت رکھتا ہے۔ان کے کئی ناول سامنے آئے جن میں ''حجاز کی آندھی''،''شمشیر بے نیام''،''دمشق کے قید خانے میں''،''ستارہ جو ٹوٹ گیا''،''اک بت شکن پیدا ہوا'' اور ''اور نیل بہتا رہا'' کو بہت شہرت ملی۔انھوں نے دیگر ناول نگاروں کی طرح تاریخی واقعات کو فکشن کی لاگ اور غیر ضروری سنسنی خیزی سے بچایا ہے اور کوشش کی کہ تاریخ مسخ نہ ہوا۔یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ انھوں مستند تاریخ ناولوں میں پیش کی ہے۔اسلامی تاریخی ناولوں میں یوں تو اسلامی شعائر کا ذکر کثرت سے ملتا ہے لیکن یہاں چندایک اقتباسات شمار کرنا کافی ہوگا۔''اور نیل بہتا رہا'' کا آغاز ہی مکہ اور مدینہ کے ذکر ہوتا ہے:

مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت کے بہت بعد کا واقعہ ہے۔رسول کریم ﷺ ابھی حیات تھے۔مکہ اور مدینہ کے درمیان پھیلے ہوئے، جلتے جھلساتے ہوئے ریگزار میں ایک مسافر،گھوڑے پر سوار، مدینہ کی طرف جارہا تھا۔وہ اکیلا تھا۔صرف گھوڑا ہی اس کا ہم سفر تھا۔جس پر وہ سوار تھا۔اس زمانے میں کوئی مسافر اکیلے سفر نہیں کیا کرتا تھا۔لوگ قافلوں کی صورت میں سفر کرتے تھے۔(۳۲)

اسلامی تاریخ میں غارحرا کا بہت ذکر ملتا ہے۔یہ غار مکہ مکرمہ میں ایک پہاڑی جبل نور پر واقع ہے اور خانہ کعبہ سے چندکلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔یہاں حضور اکرمؐ نے عبادت کا سلسلہ شروع کیا تھا اور یہیں حضور اکرمؐ پر پہلی وحی کا نزول بھی ہوا۔عنایت اللہ نے اس غار کو اس طرح یاد کیا ہے:

عرب کے ایک غار کی تاریکی سے اللہ کا نور پھوٹا جس کی کرنیں بڑی تیزی سے پھیلتی چلی گئیں اور لوگوں کے دل ودماغ کو منور کرتی گئیں۔اس غار کو غار حرا کہتے ہیں۔یہیں رسول اکرمؐ پر پہلی وحی نازل ہوئی تھی اور آپؐ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے رسالت عطا فرمائی تھی۔یہاں سے تیسری جنگی طاقت ابھرنے لگی لیکن ایک فرق کے ساتھ۔اس تیسری طاقت کو صرف جنگی ہتھیاروں پر بھروسا نہیں تھا بلکہ یہ طاقت ایک عظیم نظریے سے لیس تھی اور اس نظریے میں اللہ کی طاقت شامل تھی۔(۳۳)

فریضۂ حج کی ادائیگی اور اس سے وابستہ کچھ اسلامی شعائر کا ذکر بھی دیکھیے:

جبلہ نے جو احرام باندھا تھا وہ ٹخنوں سے نیچے چلا گیا۔خانہ کعبہ کے طواف کے دوران پیچھے آنے والے ایک آدمی کا پاؤں اس کے احرام پر جا پڑا اور احرام کھل گیا۔جبلہ آخر بادشاہ تھا۔اس نے اس شخص کی اس حرکت کو اپنی توہین سمجھا اور پیچھے مڑ کر اس آدمی کی ناک پر بڑی زور سے مکا مارا۔اس آدمی کی ناک سے خون بہنے لگا۔اُس وقت حضرت عمرؓ اس کے ساتھ نہیں تھے۔انھیں بعد میں

اطلاع ملی کہ جبلہ نے یہ حرکت کی ہے۔حضرت عمرؓ نے اس آدمی کو بلایا اور اس آدمی نے بھی شکایت کی کہ جبلہ نے اس کی ناک پر مکا مارا ہے جس سے اس کی ناک سے خون بہنے لگا اور وہ طواف مکمل نہیں کر سکا۔(۳۴)

انتظار حسین کا ناول ''بستی'' بھی بہت مقبول ہے اور اردو کے نمائندہ ناولوں میں شامل ہے۔انھوں نے اس ناول میں اسلامی شعائر کا ذکر کیا ہے مگر جزوی طور پر۔ایک جگہ قرآن اور حدیث کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

دونوں ابا جان سے کتنے مشکل مشکل سوال کرتے تھے اور ابا جان بلا تامل قرآن کی آیتیں پڑھ کر اور حدیثیں سنا کر سوالوں کا جواب دیتے تھے۔'مولانا! اللہ نے زمین کو کیسے پیدا کیا'۔تھوڑا تامل، پھر جواب، 'سوال کیا جابر بن عبداللہ انصاریؓ نے کہ قربان ہوں ہمارے ماں باپ حضورؐ پر سے، زمین کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے کس شے سے ترکیب دیا۔فرمایا سمندر کے پھیلنے سے۔پوچھا سمندر کا پھلینا کس چیز پر بنایا۔فرمایا، موج سے، پوچھا، موج کس چیز سے نکلی، فرمایا، پانی سے، پوچھا، پانی کہاں سے نکلا؟ فرمایا دانہ مروارید سے۔پوچھا دانہ مروارید کہاں سے نکلا؟ فرمایا تاریکی سے۔(۳۵)

ایک اور جگہ نماز، مجلس اور سجدوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

ایک صبح بی اماں اس طور جاگیں کہ بدن کانپ رہا تھا۔اسی عالم میں انھوں نے نماز پڑھی اور دیر تک سجدے میں پڑی رہیں۔جب سجدے سے سر اٹھایا تو جھریوں بھرا چہرہ آنسوؤں میں تر بتر تھا۔پھر انھوں نے آنچل منہ پہ رکھ کر ہلکی ہلکی آواز کے ساتھ رونا شروع کر دیا۔ابا جان نے مصلے پر بیٹھے بیٹھے غور سے بی اماں کو دیکھا۔اُٹھ کر قریب آئے۔'بی اماں! کیا بات ہے'۔'بیٹے امام کی سواری آئی تھی'۔رکیں، پھر بولیں 'ایسی روشنی جیسے گیس کا پنڈا جل گیا ہو۔جیسے کوئی کہہ رہا ہو مجلس کرو۔(۳۶)

جنت البقیع، مدینہ کا ایک قبرستان ہے جس میں نبی کریمؐ کے خاندان اور اصحاب کی قبریں ہیں۔سعودی حکومت نے اس قبرستان میں موجود مزارات کو ۱۹۳۲ میں شہید کر دیا اور ساری قبروں کے نشان کے طور پر صرف ایک دو پتھر رہنے دیے۔انتظار حسین نے اس واقعہ کے پس منظر میں جنت البقیع کا ذکر کیا ہے:

مولانا محمد علی، اللہ اللہ، جب بولتے تھے تو لگتا تھا کہ انگارے برس رہے ہیں۔مگر مجال ہے کہ کوئی کلمہ تہذیب سے گرا ہوا ہو۔خیر وہ تو مولانا محمد علی تھے، ہم نے تو کبھی کسی رضا کار کو بھی تہذیب سے گری ہوئی بات کرتے نہیں دیکھا۔انگریز کی مردہ باد کہا اور بات ختم کر دی'۔ابا جان چپ ہوئے، پھر جیسے یادوں میں کھو گئے ہوں۔بڑبڑانے لگے ''بس اس بزرگ سے ایک ہی خطا ہوئی کہ جنت البقیع کے معاملے میں آل سعود کی حمایت کی تھی۔اللہ تعالیٰ اس کے اس گناہ کو معاف کرے اور اس کی قبر کو نور سے بھر دے۔بعد میں وہ خود بھی اس حمایت پر پچھتائے تھے۔(۳۷)

ان ناولوں کے علاوہ بھی متعدد ناول ایسے ہیں جن میں اسلامی شعائر کا ذکر جزوی طور پر بھی موجود ہے اور کثرت کے ساتھ بھی۔ وہ ناول جو اسلامی تاریخ کے کسی پہلو کو سامنے لاتے ہیں، ان میں اسلامی اقدار کا بیان ہونا تو یقینی ہے تاہم ایسے ناول جو صرف سماجی اور دیگر مسائل معاملات کے حامل ہیں، ان میں اسلام کا تذکرہ کسی نہ کسی حوالے سے ضرور سامنے آتا ہے۔ مذکورہ بالا ناولوں کے علاوہ اگر دیکھا جائے تو جو ناول مقبول ہوئے ان میں فضل احمد کریم فضلی کے ناول ''خون جگر ہونے تک'' میں توحید کے موضوع کو ناول کے پلاٹ میں شامل کیا گیا ہے۔ رضیہ فصیح احمد کے ناول ''آبلہ پا'' میں اسلامی نقطہ نظر کے کچھ نکات پر بحث کی گئی ہے۔ قدرت اللہ شہاب کا ''یا خدا'' ہو یا جمیلہ ہاشمی کا ''تلاش بہاراں''، ممتاز مفتی کا ''علی پور کا ایلی'' ہو یا خدیجہ مستور کا ''آنگن''، درجنوں مشہور اور کم مشہور ناولوں سے ایسی مثالیں درج کی جاسکتی ہیں جو اسلامی شعائر کے تذکرے پر مبنی ہیں۔ یہاں تک کہ ایسے ناول نگار جو مسلمان نہیں تھے ان کے ہاں بھی اسلامی شعائر کا ذکر ملتا ہے۔ اس حوالے سے کرشن چندر کے ناول ''شکست'' کا یہ اقتباس دیکھیے:

> ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات انھیں پچھلے بیس سالوں میں کشیدہ ہوئے ہیں ورنہ اس سے پہلے دانت کاٹی روٹی والا معاملہ تھا۔ رہا یہ کہ ایک ہی مقام مذہبی اعتبار سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے متبرک کیسے ہوسکتا ہے۔ تو اس کی ایک نہیں کئی مثالیں ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے نہایت دانش مندی سے کام لیا تھا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کی تہذیب و کلچر میں سمونے کے لیے یہ مقام بہت اہمیت رکھتے تھے۔ یہاں پیر کی قبر اور پانڈؤں کے محل ساتھ ساتھ ہیں۔ اننت ناگ میں مسلمانوں کی عبادت گاہ اور ہندوؤں کا مقدس تالاب ایک ہی جگہ ہیں۔ دونوں اپنے اپنے طریق پر خدا کی عبادت کرتے ہوئے بھی ایک خاص اخوت اور یگانگت محسوس کرتے تھے۔ اکثر دیہاتوں میں مندر، دھرم شالہ اور مسجدیں ساتھ ساتھ ہوتی ہیں۔ (۳۸)

رحیم گل کا ناول ''جنت کی تلاش'' بھی روحانی تجربات پر مبنی ہے۔ عبداللہ حسین کے ناول ''قید'' میں قدامت پسند اور روشن خیال کرداروں کے درمیان مکالمہ دکھایا گیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے ناول ''راکھ'' میں چند اسلامی نکات ایک دو جگہ قلم بند کیے گئے ہیں۔ جمیلہ ہاشمی کے ناول ''تلاشِ بہاراں'' میں اسلامی دنیا کی ایک معروف شاعرہ قرۃ العین طاہرہ کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے اور ان کے ناول ''دشتِ سوس'' میں معروف صوفی بزرگ منصور حلاج کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں جن ناول نگاروں کو عہد حاضر میں بہت پذیرائی ملی، ان میں ممتاز مفتی کا الکھ نگری، بانو قدسیہ کا راجہ گدھ، التمش کا ناول داستان ایمان فروشوں کی، علیم الحق حقی کا عشق کا عین، بشریٰ رحمٰن کا پارسا، عمیرہ احمد کا پیر کامل، ہاشم ندیم کا عبداللہ، قیصرہ حیات کا الف اللہ اور آخری انسان، کامران امجد خان کا، تیمور ہوں میں، خان آصف کا بت شکن اور الیاس سیتاپوری کا ناول صادق از دکن شامل ہیں۔ ایک بات جو محسوس ہوتی ہے کہ پاکستانی ناول نگار کتنے ہی روشن خیال کیوں نہ ہوجائیں، مگر ان کے ہاں اسلامی فکر کی جھلک دکھائی دیتی ہے، کیوں کہ وہ ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں، جس میں طرزِ زندگی مذہب سے خاصا قریب ہے۔ ان کو پڑھنے والے بھی اسی فکر کے حامل لوگ ہیں، اسی لیے کسی بھی تخلیق میں مذہبی عنصر در آنا فطری بات ہے۔

بہت سے مصنفین ایسے بھی ہیں، جنھوں نے ایک سے زیادہ ناول لکھے، جن میں انھوں نے اپنی تحریر کو اسی طرزِ فکر پر مبنی کیا۔ اسلامی تاریخ اور اس کے مختلف ادوار کو پلاٹوں میں تقسیم کیا گیا اور افسانوی اور حقیقی کرداروں کے ذریعے ناول تخلیق کیے گئے۔ اسلامی فکر اور فلسفے کو اپناتے ہوئے ایک سے زیادہ ناول لکھنے والے سرفہرست ناول نگاروں میں اشفاق احمد، بانو قدسیہ، انتظار حسین، ممتاز مفتی، جمیلہ ہاشمی، التمش، خان آصف، الیاس سیتاپوری، عمیرہ احمد، ہاشم ندیم، ریاض عاقب کوہلر اور دیگر شامل ہیں۔ انھوں نے مسلسل اسلامی فکر کو اپنایا اور اسے تخلیقات کا حصہ بنایا۔ ان مندرجات سے واضح ہوتا ہے کہ اردو ناول میں اسلامی شعائر کا تذکرہ کثرت سے موجود ہے۔ اور یہ روایت آغاز سے لے کر آج تک کے ناول میں جاری ہے۔ جدید ناول میں بھی اس کا ذکر اسی طرح ہو رہا ہے جیسے پہلے ناول میں ہوا تاہم اب جدید دور کے تقاضوں کو سامنے رکھ لکھنے والے اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں اور نئے سماج کے مطابق اسلامی شعائر کو اپنی بات کی وضاحت کے لیے استعمال میں لاتے ہیں۔

اکیسویں صدی کے شروع ہونے اور اس سے ایک دو دہائیاں قبل کے ناول میں جدید رجحانات سامنے آئے۔ ناول کو اس تاریخیت کی قید سے آزادی ملی اور اس میں انسانی نفسیات اور دوسرے موضوعات کو جگہ ملی لیکن اسلامی شعائر کا تذکرہ ہر سطح پر ہوتا رہا۔ اس کی بڑی وجہ خطے میں اسلام کی تیزی سے توسیع ہے۔

اب چند اہم ناولوں میں درج اسلامی شعائر کا جائزہ لیا جاتا ہے جو اکیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں شائع ہوئے ہیں۔ ان ناولوں میں کچھ نامور لکھاریوں کے ہیں اور کچھ نئے لکھنے والوں کے۔ انتظار حسین ایک بزرگ ناول نگار ہیں۔ بیسویں صدی میں کے تین چار ناول سامنے آئے جنھیں قدر کی نگہ سے دیکھا گیا اور ان ناولوں میں اسلامی شعائر کا ذکر بھی موجود ہے۔ ان کے ناول ''بستی کا قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے۔ ۲۰۰۲ء میں انتظار حسین کا ناول ''تذکرہ'' شائع ہوا۔ اس کا آغاز ہی اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سے ہوتا ہے:

> باسم سبحانہٗ، کہ سب تعریفیں اسی کے لیے ہیں کہ جس نے ایک لفظ کن کہہ کر یہ کون و مکاں پیدا کیے اور زمین و آسمان بنائے اور کیا خوب بنائے کہ آسمان کے پھیلاؤ میں ستارے بھر دیے، بیچ میں ان کے چاند سورج رکھ دیے، اور گود زمین کی ندیوں نہروں تال تلیوں سے بھر دی کہ فیض سے ان کے باغ بغیچے پھولے اور کھیت لہلہائے۔ باغوں کو رنگ رنگ کے پھلوں سے مالا مال کیا کہ انھیں پھلوں میں وہ پھل بھی ہے جسے آم کہتے ہیں۔(۳۹)

اس ناول میں ایک اور جگہ اذان اور مسجد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس زمانے میں مسجدوں میں وعظ اور عبادت زیادہ ہوتی تھی۔ پھر اس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر کا بھی چلن نہیں تھا۔ اللہ بخشے مولوی سبحانی ہماری مسجد میں اذان دیا کرتے تھے۔ بوجان کو چراغ حویلی کی ہمسایہ مسجد یاد آ گئی۔ کیسا لحن تھا ان کی آواز میں۔ جو نماز سے بدکا ہوتا وہ بھی ان کی اذان سن لیتا تو مسجد کی طرف کھنچا چلا آیا اور کتنی اونچی آواز تھی ان کی۔ صبح کی ان کی اذان تو آس پاس کے گاؤں تک پہنچتی تھی۔(۴۰)

جب لاؤڈ سپیکر ایجاد ہوا اور مسجدوں میں اس کا چرچا عام ہوا تو بعض علما کی طرف سے اس کی مخالفت بھی کی گئی۔ کئی علما نے اسے شیطانی آلہ کہا۔ اوّل اوّل اس کے استعمال سے عوام کو بھی مشکلات پیش آئیں۔ اس صورتِ حال کا تذکرہ کرتے ہوئے انتظار حسین لکھتے ہیں:

> اے خاک پڑے تمھارے لاؤڈ سپیکر پر۔ ہماری مسجد میں یہ تمھارا نام جھام نہیں تھا۔ مولوی سبحانی تو اسے شیطانی آلہ کہتے تھے۔ کسی نے ایک دفعہ اس کا نام ان کے سامنے لے دیا تھا۔ غصے سے کانپنے لگے۔ بولے اس شیطانی آلہ مسجد میں آیا تو میں اذان دینی بند کردوں گا'۔ مگر اس محلے میں تو یہ شیطانی آلہ کو کچھ زیادہ ہی رسوخ حاصل تھا۔ آئے دن یہاں شامیانے تنتے رہتے۔ آج فلانے کی شادی ہے۔ کل ڈھماکے کے ختنے ہیں اور شامیانہ اس طرح تنتا کہ گلی بند ہوجاتی۔ شامیانے کے ساتھ لاؤڈ سپیکر کہ اس زور پر فلمی گانوں کے ریکارڈ اتنا شور کرتے کہ بوجان نماز کی خاطر کمرے کے دروازے کھڑکیاں سب بند کرلیتیں۔ کس مشکل سے نماز ختم کرتیں۔ کتنی مرتبہ تسبیح پھیرتے پھیرتے گڑبڑا جاتیں۔ جانماز لپیٹتے ہوئے بڑبڑاتیں کہ کم بختوں نے نماز پڑھنی دوبھر کردی۔ (۴۱)

مستنصر حسین تارڑ ایک اہم ناول نگار ہیں۔ اسلامی شعائر کے حوالے سے ان کے دو سفرنامے ''غارِ حرا میں ایک رات'' اور ''منہ ول کعبے شریف'' کو بہت پذیرائی ملی ہے۔ ان کا ناول ''منطق الطیر جدید'' اکیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں سامنے آنے والے ناولوں میں اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ انھوں نے صوفیانہ نظریات کے مباحث اس میں پیش کیے ہیں۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مباحث انھوں نے مختلف مکتبہ ہائے فکر کے پرندوں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> غارِ حرا کے شگافوں میں سے چاندنی کے جزیرے اترتے تھے۔ گئے زمانوں میں جب کسی قدرتی اتھل پتھل سے اس پہاڑ کی چوٹی کے پتھر گرتے گئے اور ایک گپھا کی صورت ظہور میں آئی، ان پتھروں کے درمیان میں جو شگاف تھے۔ ان میں سے چاندنی کے ٹکڑے داخل ہوئے اور اس کی تاریکی میں جزیروں کی صورت پتھروں کے فرش پر روشن ہوتے گئے۔ ان شگافوں میں سے ایک شگاف کے اندر پرندہ ازل سے مقیم تھا جو فنا سے آشنا نہ تھا۔ ازمنہ قدیم سے وہ مختصر گپھا ان لوگوں کی پناہ گاہ تھی جو تجسس رکھتے تھے۔ متلاشی تھے۔ اور انھیں حنیف کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ وہ سچ کی تلاش میں اس غار کی بلند تنہائی میں خلقت سے الگ ہو کر تنہا آبیٹھتے، گیان اور دھیان میں گم بیٹھتے تھے، وہ پرندہ ان کے کاندھوں پر بیٹھ کر ان کے کانوں میں وحدت کے گیت گاتا، چہکتا رہتا۔ (۴۲)

اس ناول میں ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں:

> خاص طور پر وہ سب پرندے جنھوں نے عطار کے نوک قلم سے جنم لیا ''منطق الطیر'' کے جمگھٹے میں شامل اِسی مرغ کے متلاشی تھے، سلیمان کا رازدان ہدہد جو ان سب کا مرشد اور قائد تھا۔ کوہِ طور کی وہ

فاختہ جس نے موسیٰؑ کی رفاقت میں اس آگ کا نظارہ کیا، وہ طوطا جس کا گھونسلا جنت کے شجر میں پنہاں تھا اور وہ مرغابی جو اس راستے کی مسافر ہوئی جو دنیا سے لپٹے پہاڑ قاف کی جانب جاتا تھا۔ وحدت کے غار کا مکین عقاب، بلبل جو داؤدؑ کے ہمراہ نغمہ سار ہوئی تھی، آٹھ دروازوں والے جنت کے باغوں میں رقص کرتا مور، کبوتر جو یونسؑ کی مانند اپنی انا کی مچھلی کے پیٹ کے اندر نگلا گیا۔ سب کے سب وحدت کے ایک ہی دھاگے میں بندھے ہیں۔ ایک ہی ڈور میں پروئے ہوئے اور اس ڈور کو لک چھپ کے عطار کھینچتا ہے یوں کہ ہر پرندے کے دل میں یہ ڈور ایک گانٹھ باندھتی ہے جیسے غار حرا کے فرش پر اس کے جوتوں میں گانٹھی ہوتی ہے۔(۴۳)

ان اقتباسات میں تصوف کے اسرار و رموز کے ساتھ غار حرا، مرشد، جنت، انبیا کرام موسیٰ، سلیمانؑ، یونسؑ، داؤدؑ، صوفی عطار اور کچھ دیگر مذہبی و اسلامی شعائر کا ذکر بھی آ گیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول ''قلعہ جنگی'' افغان جہاد کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اور یہ ناول ۲۰۰۸ میں شائع ہوا۔ اس ناول میں بھی کئی مقامات پر اسلامی اشعائر کا تذکرہ ملتا ہے۔ مثال کے طور پر:

وہ کسی شریعت یا شہادت یا جہادی ملا کے فلسفے سے متاثر ہو کر صدق دل سے... اگر چہ کچی عمر کی ناپختہ فہم کے صدق دل سے... ادھر آ نکلا تھا... اسے کچھ پتا نہ تھا کہ اس کے مدمقابل جو کافر ہوں گے وہ شاید اس سے کہیں بڑھ کر پرہیز گار... شریعت کے پابند اور باریش ہوں گے اور وہ بھی شہادت کے طالب ہوں گے اور کسی مولانا سینڈوچ کا بہکایا ہوا صدق دل سے بے دھیانی میں ادھر آ نکلا تھا اور اسے یہ گمان بھی نہ تھا کہ راہ حق میں شہید ہونے کے بعد بھی وہ ایک منفرد رقاص ہو جائے گا۔(۴۴)

ایک اور جگہ جمعرات کو قبرستانوں میں دیئے جلانے کی رسم کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

اللہ بخش اگر آج جمعرات ہو تو کیا ہو۔ بس عربی بھائی جی خیال ہی خیال ہی میں میرے ذہن میں خیال آ گیا کہ ہمارے گاؤں کے قبرستان میں... بڑے جوہڑ کے پار چوہدری منور کے مالٹے کے باغوں کے برابر میں جو قبرستان ہے جاٹ برادری کا... جہاں کمی کمین ہم جیسا مرجائے تو اس کی قبر کناروں پر بنتی ہے اور چوہدری لوگ درمیان میں دفن ہوتے ہیں۔ وہاں سروٹوں سے پرے... ویرانے میں... جہاں صرف سانپ، نیولے اور چڑی رہتے ہیں وہاں ہر جمعرات کو ہر دوسری قبر پر دیے جلتے ہیں، موم بتیاں اور اگربتیاں روشنی کرتی ہیں... تو یہ نہ ہو کہ آج جمعرات ہو اور او پر قلعہ جنگی کے ویہڑے میں پڑی لاشوں کے قبرستان میں دیے جلتے ہوں، موم بتیاں روشن اور ہم باہر نکلیں تو پہچانے جائیں، پکڑے جائیں۔(۴۵)

حضرت علیؓ کا مزار کہاں ہے، اس میں اختلاف ہے۔ ایک طبقہ کی رائے یہ ہے کہ یہ مزار شریف افغانستان میں ہے۔ تارڑ اس

کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

> انھوں نے قریب ہو کر رخنوں اور محرابوں سے اپنی آنکھیں لگائیں تو مزار شریف کی روشنیاں صحرا کے سراب میں جھلملاتی... مگر چاندنی میں سرائیت کرتیں ان تک آئیں... اور ان میں روشنی کا جو سب سے بڑا جگمگا تھا وہ اس شاندار نیلی اینٹوں والی گنبدوں میں ابھری ہوئی عمارت میں سے جنم لیتا تھا جس کے بارے میں روایت تھی کہ وہ حضرت علیؓ کا مرقد ہے۔اور اس روایت نے ایک خواب سے جنم لیا ہے... کہا جاتا ہے تھا کہ بلخ شہر جو مولانا روم کی جنم بھومی تھا وہاں کے ایک پارسا کو کئی راتوں تک مسلسل ایک خواب میں حضرت علیؓ بلخ سے کچھ فاصلے پر اپنی آخری آرام گاہ کی نشاندہی کرتے رہے۔اور جب کھدائی کی گئی تو وہاں سے حضرت علیؓ کے ہاتھوں کا لکھا قرآن پاک اور چند ہڈیاں برآمد ہوئیں اور پھر اسی مقام پر ان کا مزار تعمیر کیا گیا۔(۴۶)

نئی صدی کے ناولوں میں مرزا اطہر بیگ کے ناول ''غلام باغ'' کا بہت چرچا ہوا۔اگرچہ یہ ناول فلسفیانہ رنگ کا حامل ہے لیکن اس میں بھی اسلامی شعائر کا ایک حوالہ یوں نظر آتا ہے: ''اور پھر وہ سب کچھ جو بیتا اور جس نے اسے تخلیق کے خدائی لمحے کے سحر میں گرفتار کر دیا تھا لیکن وہ لمحہ تیزی سے مٹ رہا تھا۔میں صرف خدا نہیں ہوں بلکہ شیطان بھی ہوں۔خدا تخلیق کرتا ہے اور شیطان تنقید کرتا ہے۔''(۴۷)

خالدہ حسین کا ناول ''کاغذی گھاٹ'' نئی صدی کے آغاز پر شائع ہوا ہے۔اس میں انھوں نے ناسٹیلجیا کو موضوع بنایا ہے۔اس ناول میں اسلامی شعائر کا ذکر بھی جزوی طور پر موجود ہے:

> بڑے ابا اس کولوئی کی بکل میں لیے مثنوی مولانا روم پڑھتے۔کبھی کبھی ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے۔پھر وہ تاریخِ اسلام کا کوئی باب لے کر بیٹھ جاتے۔حضرت خالد بن ولید کی تیغ فضاؤں میں بجلی کی طرح لہراتی، تڑپتی، االماں، االماں کی پکار اٹھتی۔گھوڑوں کی ٹاپیں اس کے دل کی باؤلی دھڑکن کے ساتھ مل جاتیں... سازشوں کے جال بچھتے... ایک سرد آہ پھر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھ کے اس پر اور چاروں سمت دم کرتے۔سیدی انت حبیبی وطبیب قلبی۔(۴۸)

اسی طرح ایک اور جگہ تصوف سے وابستہ کچھ شعائر کا ذکر بھی کیا گیا ہے:

> نانی کے پاس کوئی بہت اَن ہونی پر اسرار داستان تھی... یہاں پر ایک غیر حاضر شخصیت کا سحر طاری تھا۔ ماما عبداللہ اور بابا غالم محمد دونوں ہی سائیں توڑی شاہ کے مجاور بن چکے تھے... ماما کو اکثر اشارے اور الہام ہوا کرتے تھے... ان کا جنون ان کے کچھ بیٹوں میں بھی سرایت کر گیا تھا۔لہٰذا انہوں نے قوال پارٹی بنا رکھی تھی۔(۴۹)

محمد حمید شاہد یوں تو افسانہ نگار کے طور پر مشہور ہیں اور ان کی تنقید کا بھی چرچا رہتا ہے لیکن انھوں ۲۰۰۸ء میں ''مٹی آدم کھاتی

ہے'' کے عنوان نے ایک ناول بھی لکھا جسے قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔اس ناول میں اسلامی شعائر کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے تاہم ناول کے آخر میں مولوی دوزخی کا ایک کردار متعارف کراتے ہیں اور،اس کی ذیل میں ہابیل اور قابیل کے اس واقعہ کا ذکر بھی کرتے ہیں جو اسلامی کتب میں مذکورہ ہے:

> ''ہم زمین کھودنے والے کوے ہیں۔'' لگتا ہے یہ جملہ لکھ کر وہ کاغذ پر جھک کر بہت دیر روتا رہا ہوگا۔یہیں قریب ہی'ہابیل' اور' قابیل' کو الگ الگ لکھ کر ان کے گرد دائرے لگا کر دونوں الفاظ کو نمایاں کیا گیا ہے۔یہ دونوں الفاظ اسی صفحہ پر ذرا نیچے لکھے گئے ہیں جس پر اوپر کی جانب'مولوی دوزخی' لکھ کر کاٹا گیا تھا۔یوں گمان گزرتا ہے کہ یہ کہانی لکھنے والے نے مولوی دوزخی سے ہابیل اور قابیل کی کہانی سن رکھی ہوگی جس میں ایک کوا زمین کھود کر لاش دبانے کا گر بتاتا تھا۔(۵۰)

طاہرہ اقبال کے ناول''نیلی بار''،''گراں'' اور''گنجی بار'' نے قارئین کی توجہ حاصل کی اور انھیں ایک اہم ناول نگار کے طور قبول کر لیا گیا۔ان کا فکشن الگ سج دھج اور زبان کے خاص مزاج کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے۔انھوں نے پنجابی ملی اردو استعمال کی ہے۔ ان کے ناول''نیلی بار'' میں سیاسی،سماجی اور مذہبی منظرنامہ سامنے آتا ہے۔مذہبی منظرنامہ میں خصوصی طور پر پیری مریدی کا ذکر ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

> زیارت کا وقت شروع ہو چکا تھا۔مریدین کی لمبی لمبی قطاریں بندھی تھیں۔سروں پر رومال باندھے سینوں پر دونوں ہاتھ جوڑے نگاہیں جھکی قدم قدم حدِ ادب میں بڑھتے ہوئے کہیں سوئے ادب نہ ہو جائے ... خبردار یہ بارگاہِ ادب واحترام ہے ... بے ادبی کا شائبہ بھی عمروں اور آنے والی نسلوں کو برباد کر دے گا۔مزار کی گوٹا کناری جڑی چادروں کی طرح اپنی کنواری نوعمر لڑکیاں بھی پیر خانوں کو" نذر" کر جاتے تھے ... یہ لاڈلیاں اچھی طرح جانتی تھیں کہ پیر خانے کا ذلیل ترین کام بھی قیامت کے روز نامہ اعمال میں سب سے اتم لکھا جائے گا بلکہ جیتنا ذلیل ہوگا جنت کا حصول اُتنا ہی سہل ہوتا چلا جائے گا اور وہ اپنے گنہگار والدین کے لیے جنت کے دروازے پر دربان بنکر کھڑی ہو جائیں گی۔(۵۱)

اسی طرح ناول کا ایک کردار'' علی جواد' مدرسے میں جہادی درس کا کام انجام دیتا ہے۔ایک دِن'' زارا'' جو ناول میں مذہبی امور کی وزیر ہوتی ہیں،ان کا ۱۲ سال کا بیٹا جب شہادت کی خواہش میں جہاد کرنے نکل پڑتا ہے۔زارا تو اپنا بیٹا واپس بلوا کر امریکا سدھار جاتی ہے اور دوسری طرف علامہ محمد علی معاویہ کو اس کا ایک شاگرد خودکش بمبار بن کر موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔یوں اس ناول میں''شہادت''،''جہاد''،''مدرسہ'' جیسی اسلامی علامات بھی نظر آتی ہیں۔

حفیظ خان کا نام بھی اکیسویں صدی کے اہم ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کے اب تک سات ناول شائع ہو چکے ہیں جن میں ''ادھ ادھورے لوگ''،''انواسی''،''منتارہ''،''کرک ناتھ''،''حیدر گوٹھ کا بخشن''،''وجود'' اور''ایک جنم کی جاتما'' شامل ہیں۔ان کے

آخری ناول میں اسلامی شعائر کا ذکر اس طرح سامنے آتا ہے:

اس نے دیکھا کہ امام مسجد کے حجرے کی بیرونی دیوار میں بنے ہوئے ایک چھوٹے سے چراغ دان میں سرسوں کے تیل سے روشن کیا گیا مٹی کا دیا لو دے رہا تھا۔'بجانے کب، کس نے یہ دیا روشن کیا ! مولوی صاحب کے علاوہ کون ہوسکتا ہے؟' حق نواز نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا اور خود ہی جواب دے کر مطمئن ہو بیٹھا لیکن اسے دکھ تھا کہ مولوی نے مسجد میں آئے خدا کے مہمان سے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔(۵۲)

ناول کے کردار حق نواز کے مسجد میں جانے اور وہاں ایک رات گزارنے کے حوالے سے حفیظ خان مزید لکھتے ہیں:

اس دوران مولوی بھی مسجد میں آیا اور عشا کی اذان کہہ کر واپس حجرے میں چلا گیا۔ اذان کے دس پندرہ منٹ بعد اکا دکا نمازی بھی مسجد میں آنے لگے لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جسے گل محمد کہا جاسکے۔ سبھی مقامی بستی کے تھے۔ اس دوران نماز کا وقت ہو گیا حق نواز سمیت پانچ لوگوں نے نماز ادا کی۔ فرض نماز کے بعد مولوی پھر سے حجرے میں جانے لگا تو حق نواز اٹھ کر اس کے سامنے آ گیا۔ حق نواز کا سوال دیے کی مدہم روشنی میں بھی اس کے چہرے سے ہویدا تھا۔ اس سے پہلے کہ حق نواز اس سے کچھ پوچھتا مولوی خود بول پڑا' لگتا ہے گل محمد نے مائی پھلاں کو تلاش کرلیا ہے۔'(۵۳)

حفیظ خاں نے اسلامی شعائر میں سے نماز جنازہ اور سوگ کا ذکر بھی کیا ہے: ''کیا وہ بھی نواب کے مرنے کا سوگ منا رہا ہے یا ڈیرہ اور چلا گیا تاکہ نواب کے جنازے میں شریک ہو سکے۔''(۵۴)

اسی طرح نکاح اور مفتی کا ذکر بھی ان کے مذکورہ بالا ناول میں اس طرح سامنے آتا ہے:

جو کنیزیں نہ تو آپ کے والد مرحوم و مغفور کے سامنے لائی گئیں اور نہ ہی ان میں سے کسی کو خلوت کے لیے منتخب کیا گیا تو پھر وہ کس واسطے آپ پر حرام ٹھہریں' ''ہمیں اس بارے میں مفتی ریاست کی رائے درکار ہوگی'۔ نواب نے ہاتھ بڑھا کر شطرنج کی بازی کو خود سے پرے کرتے ہوئے کہا۔ ایسا کہتے ہوئے وہ منشی چوکس رائے سے آنکھ نہیں ملا پا رہا تھا'۔ جو سرکار کا حکم ! ویسے مفتی صاحب کی رائے میری گزارش سے مختلف نہیں ہوگی'، منشی کے لہجے میں تمام تر ادب کے ساتھ ساتھ ہلکی سی خفگی بھی مترشح تھی۔ ''آپ مفتی تو نہیں پھر کس طرح تیقن سے کہہ سکتے ہیں''۔ نواب کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔(۵۵)

ریاض عاقب کوہلر کا نام بھی نئی صدی کے معروف ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے درجن بھر ناول شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے تقریباً تمام ناولوں میں اسلامی شعائر کا ذکر ملتا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:

مخبر صادقؐ نے فرمایا تھا' تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو خود قرآن پڑھے اور دوسروں کو

پڑھائے۔میرا مشورہ ہے آپ حفظ کرنا شروع کردیں۔اس سے بہترین مصروفیت کوئی نہیں،اس سے اچھا عمل کوئی نہیں،اس سے بڑھ کر نیکی کوئی نہیں،اس سے اعلیٰ مشغلہ کوئی نہیں'۔معاویہ کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی'کیا یہ ممکن ہے'؟'عثمان شاہ وثوق سے بولے' آپ کا کام خلوص نیت سے کوشش کرنا ہے۔آسانیاں پیدا کرنا اس کا کام جس کے صرف ارادے سے ہر ناممکن ثابت قدمی بھول جاتا ہے'۔معاویہ نے مایوسی ظاہر کی'میں تو ناظرہ بھی ٹھیک سے نہیں پڑھ سکتا'۔'حفظ شروع کردو رفتہ رفتہ آسانیاں بڑھتی جائیں گی۔(۵۶)

اسی طرح اس ناول میں ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں:

ہاں جو توبہ کرلیتے ہیں اور اپنی حالت درست کرلیتے ہیں اور احکام الٰہی صاف صاف بیان کردیتے ہیں تو میں ان کے قصور معاف کردیتا ہوں اور میں بڑا معاف کرنے والا بڑا مہربان ہوں۔(سورہ بقرہ: ۱۲۰) معاویہ نے طمانیت سے کہا'توبہ کی خوش خبری سے دل کو اتنا اطمینان وسکون ہوتا ہے کہ بیان سے باہر ہے البتہ شمورانی کی کچھ سمجھ نہیں آتی'۔مفتی صاحب اشتیاق سے بولا'میرا خیال ہے شمورانی کی کہانی سنا ہی دو'۔'نماز کے بعد گپ شپ ہوگی' معاویہ شام کی اذان دینے مسجد میں گھس گیا۔(۵۷)

گزشتہ بیس سالوں میں ان کے علاوہ بھی کئی ناول سامنے آئے ہیں جن میں تارڑ کا ''خس وخاشاک زمانے''،حامد بیگ کا ''انارکلی''،محمد الیاس کے ''کہر''،''حبس''،''بارش''،''برف''،''دھوپ'' اور ''پروا''،عاطف علیم کا ''شمشان گھاٹ''،''مشک پوری کی ملکہ'' اور ''گرد باد''،خالد طور'' کانی آنکھ''،خالد فتح محمد کا ناول ''زینہ''،''،زیف سیّد کا ناول ''گل مینہ'' اور '' آدھی رات کا سورج''،آمنہ مفتی کا ''پانی مر رہا ہے اور '' آخری زمانہ''،ڈاکٹر وحید احمد کا ''زینو'' اور ''مندری والا''،اختر رضا سلیمی کے ناول ''جاگے ہیں خواب میں'' اور ''جندر''،عاصم بٹ کے ناول ''دائرہ''،''ناتمام''،''بھید''،نجم الدین احمد کا ''کھوج''،شیراز دستی کا ''ساسا''،یونس جاوید کا ''کنجری کا پل''، اقبال خورشید کے ناول ''تکون کی چوتھی جہت'' اور '' گرد کا طوفان''،کاشف رضا کا ''چار درویش اور کچھوا'' اور علی اکبر ناطق کے ناول ''نولکھی کوٹھی'' اور ''کماری والا'' شامل ہیں۔ان کے علاوہ بھی کئی ناول شائع ہوئے لیکن یہاں صرف ان ناولوں کا ذکر کیا گیا جنھیں قارئین ادب کی توجہ حاصل ہوئی اور ناقدین نے ان کو اہم ناول قرار دیا۔مذکورہ ناولوں میں جزوی طور پر تو اسلامی شعائر کا ذکر ملتا ہے لیکن جن ناولوں میں اسلامی شعائر کا تذکرہ زیادہ رہا ان میں سے اقتباسات درج کردیے گئے۔اس مختصر سے جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ اردو ناول نئی صدی میں بھی اسلامی شعائر کے ذکر سے خالی نہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ابوالحسن علی ندوی،''کاروانِ مدینہ''،مجلسِ تحقیقات ونشریاتِ اسلام،لکھنؤ،۲۰۰۱ء،ص ۷۸

۲۔ صباحت قمر (مترجم)،''رومانویت ایک تنقیدی اصطلاح''، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۲۰۱
۳۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی،''تاریخ ادب انگریزی''، شعبۂ نشر و اشاعت، جامعہ کراچی، ۲۰۰۷ء، ص ۹۶
۴۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۵۱
۵۔ سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۱۴
۶۔ ڈپٹی نذیر احمد،''مرأۃ العروس''، رومیل ہاؤس آف پبلی کیشن، راول پنڈی، ۲۰۱۷ء، ص ۱۴
۷۔ ایضاً، ص ۱۴، ۱۵
۸۔ ایضاً، ص ۱۰۲
۹۔ ایضاً، ص ۲۰۰
۱۰۔ ایضاً،''بنات النعش''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۴۹
۱۱۔ رفعت اقبال خان،''اردو ناول میں تہذیبی و ثقافتی بازیافت''، مقالہ ایم فل مخزونہ علامہ اقبال یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء، ص ۵۷
۱۲۔ عبدالحلیم شرر،''فردوسِ بریں''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۲۷
۱۳۔ ایضاً، ص ۲۸
۱۴۔ ایضاً، ص ۹۶
۱۵۔ مرزا ہادی رسوا،''امراؤ جان ادا''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۲۴
۱۶۔ ایضاً، ص ۶۲
۱۷۔ ایضاً، ص ۱۴۹
۱۸۔ ایضاً، ص ۱۵۷
۱۹۔ ایضاً، ص ۱۵۸
۲۰۔ قرۃ العین حیدر،''آگ کا دریا''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۷۹ء، ص ۱۵۶، ۱۵۷
۲۱۔ ایضاً، ص ۱۶۴
۲۲۔ عبداللہ حسین،''باگھ''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۱۶۶
۲۳۔ ایضاً، قید، ایضاً، ۱۹۹۵ء، ص ۲۰
۲۴۔ ایضاً، ص ۲۷
۲۵۔ شوکت صدیقی،''خدا کی بستی''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۲۸
۲۶۔ ایضاً، ص ۳۷۸
۲۷۔ صدیق سالک،''پریشر ککر''، مکتبہ سرمد، راول پنڈی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۴
۲۸۔ ایضاً، ص ۳۱
۲۹۔ نسیم حجازی،''آخری چٹان''، پرویز بک ڈپو، دہلی، س ن، ص ۱۳، ۱۴
۳۰۔ ایضاً،''اور تلوار ٹوٹ گئی''، کتب خانہ صدیقیہ، دہلی، ۲۰۰۱ء، ص ۲۵
۳۱۔ ایضاً،''داستانِ مجاہد، قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۵۰ء، ص ۱۵
۳۲۔ عنایت اللہ،''اور نیل بہتا رہا''، حکایت پبلی کیشنز، لاہور، س ن، ص ۵
۳۳۔ ایضاً، ص ۳۱

۳۴۔ ایضاً،ص ۳۳
۳۵۔ انتظار حسین،''بستی''،مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۸۰ء،ص ۷
۳۶۔ ایضاً،ص ۱۵
۳۷۔ ایضاً،ص ۲۲
۳۸۔ کرشن چندر،''شکست''،ایشیا پبلشر، دہلی، ۱۹۹۸ء،ص ۳۳
۳۹۔ انتظار حسین،''تذکرہ''،سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء،ص ۵
۴۰۔ ایضاً،ص ۲۶
۴۱۔ ایضاً،ص ۲۶
۴۲۔ مستنصر حسین تارڑ،''منطق الطیر جدید''،سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء،ص ۲۱
۴۳۔ ایضاً،ص ۲۷
۴۴۔ ایضاً،''قلعہ جنگی''،سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء،ص ۴۹
۴۵۔ ایضاً،ص ۹
۴۶۔ ایضاً،ص ۲۱
۴۷۔ مرزا اطہر بیگ،''غلام باغ''،سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء،ص ۳۸
۴۸۔ خالدہ حسین،''کاغذی گھاٹ''،سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء،ص ۲۵
۴۹۔ ایضاً،ص ۴
۵۰۔ محمد حمید شاہد،''مٹی آدم کھاتی ہے''،اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۱۸ء،ص ۱۲۱
۵۱۔ طاہرہ اقبال،''نیلی بار''،دوست پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء،ص ۵۶
۵۲۔ محمد حفیظ خان،''ایک جنم کی جاتما''،بک کارنر، جہلم، ۲۰۲۴ء،ص ۱۷۱
۵۳۔ ایضاً،ص ۱۷۱، ۱۷۲
۵۴۔ ایضاً،ص ۱۹۹
۵۵۔ ایضاً،ص ۲۰۹
۵۶۔ ریاض حاقب کوہلر،''بھگستان''،القریش پبلشرز، لاہور، ۲۰۲۰ء،ص ۲۸۹
۵۷۔ ایضاً،ص ۲۹۹

❁❁

محمد شاہد حفیظ ⁕

محمد حفیظ خان کے ناول ''انواسی'' کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ

مابعد نوآبادیات یا پس نوآبادیات ایک جدید تنقیدی اصطلاح ہے۔ اسے انگریزی میں Post Colonialism کہا جاتا ہے۔ مابعد نوآبادیات کو جاننے سے پہلے نوآبادیات کو جاننا ضروری ہے۔ نوآباد دراصل دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔ نو (نیا) آباد (آباد ہونے والا) یعنی نوآباد کسی علاقے میں نئے آباد ہونے والوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک سیاسی اصطلاح ہے جس میں کسی ملک کا اپنے ملک سے باہر دوسرے ملک یا ممالک میں آبادیاں قائم کرنا اور اردگرد کے علاقوں پر قبضہ کرکے اپنے مفادات پورے کرنا نوآبادیاتی نظام کہلاتا ہے۔ نوآباد کار سب سے پہلے قابض ملک پر اپنے قوانین لاگو کرتے ہیں پھر اپنا مذہب اور ثقافت بھی لاگو کرنے کے لیے ان کا استحصال کرنے لگتے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال آفاقی ''مابعد جدیدیت'' میں لکھتے ہیں:

> نوآبادیات سے مراد غیر اقوام کے علاقوں اور ملکوں کی فتح اور ان کا براہِ راست انتظام و انصرام ہے۔ مغربی نوآبادیاتی نظام ماضی قریب کی انسانی تاریخ کا ایک باب ہے جسے یورپی استعمار کا نام دیا جاتا ہے۔

نوآبادیات کے بعد جو دور آتا ہے اسے مابعد نوآبادیاتی نظام یا مابعد نوآبادیاتی دور کہا جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال معاشرے کے دیگر امور کی طرح ادب پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ جس میں نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادتی دور کے محرکات، وجوہات، اسباب اور معیارات وغیرہ کو پرکھنے کا عمل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ماضی میں ہونے والے واقعات، عمل اور ردعمل کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے۔ اس دور کو استعماری اور سامراجی دور بھی کہا جاتا ہے۔ دنیا کے دیگر ممالک کی طرح استعماری قوتوں نے برصغیر کے لوگوں کو غلام بنا کر سیاسی، معاشی، تہذیبی اور ادبی سطح پر ان کا استحصال کرنے کا ایک تلخ تجربہ کیا۔ اس استعماری دور کا اردو ادب پر گہرا اثر ہوا جس کا اظہار ہمیں اردو شعر و ادب میں ملتا ہے۔ اس قسم کے ادب میں استعمار سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ اس سے لڑنے اور اس کے خلاف مزاحمت کا انداز بھی موجود ہے۔

محمد عامر سہیل ''نوآبادیات و مابعد نوآبادیات'' میں رقم طراز ہیں:

> مابعد نوآبادیاتی تنقید میں نقاد متن کا ثقافتی مطالعہ کرتا ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ نوآبادیاتی عہد اور مابعد نوآبادیاتی عہد کے ادیب نے ثقافت کو کس زاویے سے پیش کیا ہے۔ کیا وہ اپنی ثقافت کو کم تر تو نہیں

⁕ نزد ڈاک خانہ سائیفن روڈ، میلسی، ضلع وہاڑی۔ فون: ۰۳۰۱-۶۵۷۳۹۵۴

دیکھ رہا؟ اگر مقامی ثقافت کی بالادستی، احیا، بازیافت چاہتا ہے تو اس کے لیے اس نے کون سا راستہ اپنایا ہے؟ کیا وہ استعمار کار کی ثقافت سے مرعوب تو نہیں؟ اگر نہیں تو مقامی ثقافت کو کس حد تک اہمیت دے رہا ہے؟ استعمار کار نے کن ہتھکنڈوں سے ثقافتی بالادستی حاصل کی ہے، ادبی متن کا تجزیہ کرنا کہ کردار کس قدر استعمار کی ثقافت سے اثر لیتے ہیں اور انھیں اپنانے یا رد کرنے میں کس قدر صلاحیت رکھتے ہیں؟ ان تمام سوالوں کا جواب مابعد نوآبادیاتی نقاد ادبی متن کا مطالعہ/ تجزیہ کر کے پیش کرے گا۔

اردو میں ناول کا آغاز بھی نوآبادیاتی دور میں ہوا۔ اس لیے اردو ناول میں نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی دونوں طرح کی صورت حال کی عکاسی موجود ہے۔ نوآبادیاتی دور کے اثرات جس طرح ناول میں موجود ہیں شاید ہی کسی دوسری صنف میں ایسا اظہار موجود ہو۔ استعماری کش مکش کے حوالے سے اردو کے پہلے ناول نگار مولوی نذیر احمد کے ناول ''توبۃ النصوح'' اور ''ابن الوقت'' اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے بعد رتن ناتھ سرشار اور مولانا عبدالحلیم شرر کے ناولوں میں بھی ثقافتی کش مکش کے اثرات نظر آتے ہیں۔ اکیسویں صدی میں اردو ناول نے نئی جہت متعارف کرواتے ہوئے اسے کلاسیکیت سے جدیدیت کی راہ دکھائی۔ ان ناولوں میں نئی کہانی اور نئے لوکیل کی مدد سے استعماری اور ثقافتی کش مکش کی خصوصی پیش کش ملتی ہے۔ محمد حفیظ خان بھی اکیسویں صدی کے اہم ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولوں کے مطالعہ سے برصغیر کا ماضی اور مقامی ثقافت کی بازیافت اور تشکیل کے موضوعات ملتے ہیں۔

محمد حفیظ خان اردو اور سرائیکی کے نامور ادیب ہیں۔ ان کی ہمہ جہتی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اردو اور سرائیکی کے شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، ڈراما نگار، کالم نگار، مترجم، نقاد اور مؤرخ ہیں۔ محمد حفیظ خان جنوبی پنجاب کے شہر احمد پور شرقیہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی ملتان سے ایم اے (تاریخ) کرنے کے بعد ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی اور پوسٹل سروس میں کام کرنے کے بعد سول جج کی حیثیت سے عدلیہ میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے ۱۹۷۵ء میں ریڈیو بہاول پور کے آغاز سے ہی لکھنا شروع کر دیا۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ، ناول نگار اور شاعر ہیں۔ انھوں نے ریڈیو کے لیے سرائیکی ڈرامے بھی لکھے۔ حفیظ خان سرائیکی ادب میں پہچان بنانے کے بعد اردو ادب میں بھی معتبر مقام حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی اب تک تقریباً ۳۲ کتب شائع ہو چکی ہیں جن میں چھے ناول شامل ہیں۔ انھوں نے اپنا پہلا ناول سرائیکی میں ''ادھ ادھورے لوگ'' لکھا جسے بعد میں خود ہی اردو میں بھی منتقل کیا۔ ان کا دوسرا سرائیکی ناول ''مرماجیون دی'' ہے۔ اردو میں اب تک ان کے چھے ناول، ادھ ادھورے لوگ، انواسی، کرک ناتھ، منتارا، حیدر گوٹھ کا بخشن اور وجود شائقینِ فکشن کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

محمد حفیظ خان بلاشبہ موجودہ دور کے ناول نگاروں میں ایک اہم نام ہیں۔ ''انواسی'' ان کا دوسرا ناول ہے جس کا پہلا ایڈیشن جون ۲۰۱۹ء اور دوسرا ایڈیشن دسمبر ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا۔ اس مختصر عرصے میں ناول کا دوسرا ایڈیشن چھپنا اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونا ناول کی ادبی حیثیت اور اس کی پذیرائی کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ اس ناول میں جنوبی پنجاب کا سرائیکی لوکیل پیش کیا گیا ہے۔ یہ کہانی ضلع لودھراں اور ضلع بہاول پور کے درمیان بہنے والے دریائے ستلج کی ایک چھوٹی سی بستی ''آدم واہن'' پر مشتمل تاریخ کے گمشدہ اوراق پر مشتمل ہے جسے ۴۵ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کہانی میں ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۵ء کے وسط کا زمان و مکان پیش کیا گیا ہے۔ ناول

کا منفرد انتساب ملاحظہ فرمائیں:

''کینہ، بغض، حسد اور خوئے انتقام کے نام..... کہ جن کے دم سے ''محفلیں'' روبہ ہنگام ہیں۔''

''انواسی'' میں انیسویں صدی کے آخری نصف کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ جب انگریز اپنا ریلوے کا نظام لے کر برصغیر پہنچے۔ کراچی سے لاہور تک ریلوے ٹریک بچھاتے ہوئے بہاول پور کے نزدیک دریائے ستلج پر ایمپریس برج بنانے لگے تو اس کہانی کا آغاز ہوا۔ اس ناول کی کہانی دریائے ستلج پر بنائے گئے ایمپریس پل کے اردگرد گھومتی ہے جس کے تعمیر کے دوران یہ مسئلہ پیش آیا کہ بستی آدم واہن کا قدیمی قبرستان پل کی تعمیر والی جگہ پرآ گیا۔ انگریز پل تعمیر کرنے کے لیے قبرستان ختم کرنا چاہتے تھے لیکن بستی کے جیالے اس فیصلے کے خلاف آہنی دیوار بن کر کھڑے ہوگئے کیوں کہ وہ اپنے پرکھوں کی قبریں کسی طور نہیں کھونا چاہتے تھے۔ ناول نگار نے اس تنازعات بھری جنگ کو اتنی خوب صورتی سے پینٹ کیا ہے گویا کیمرے سے عکاسی کی ہے۔

ناول کا آغاز ہی نہایت اچھوتا اور چونکا دینے والا ہے جو ابتدا ہی میں قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور وہ اختتام تک ناول پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

> ۱۲ جنوری ۱۸۷۲ء۔ لودھراں اور بہاول پور کے درمیان بہنے والے دریائے ستلج کے شمالی جانب بستی آدم واہن میں اس روز ایک حشر سا بپا تھا کہ جس میں خوف، دہشت اور غصہ ایک ساتھ یہاں کے مکینوں کے ذہن میں انڈیل دیے گئے تھے۔ غصے سے بھرے ہوئے جوان بستی کے باہر جمع تھے جب کہ بوڑھے اپنی شکن آلود پیشانیوں کے ساتھ بستی کے وسطی چوک میں بڑے بڑے ماچے بچھا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ عورتیں کام کاج چھوڑ کر گھروں سے باہر جھانکتی ہوئیں اور بچے اس ساری صورتِ حال کا ادراک کیے بغیر کبھی خاموش مگر فکرمند بوڑھوں کے گرد جمع ہو جاتے اور کبھی منھ اٹھا اٹھا کر بستی کے باہر موجود غصے سے کھولتے ہوئے نوجوانوں کی جوشیلی باتیں سننے پہنچ جاتے۔ ان کا جی تو چاہتا تھا کہ وہ نوجوانوں کے ساتھ ہی بستی کے باہر رہیں مگر ان کی خوف زدہ ماؤں کی دہشت زدہ آوازیں انھیں پھر سے اندر کھینچ لاتیں۔

''انواسی'' ایک ایسا ناول ہے جسے محمد حفیظ خان نے پانچ سے چھے ماہ کی انتہائی کم مدت میں تحریر کیا ہے۔ اس میں انھوں نے فرضی کرداروں کی معاونت سے ۱۸۷۲ء اور مابعد کا حقیقی منظر نامہ مقامی کینوس پر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کرداروں کی مدد سے جن واقعات کی طرف نشاندہی کی گئی ہے ہماری تاریخ میں ایسے واقعات دفن ہو چکے ہوں گے لیکن ناول نگار نے نہ صرف ان پوشیدہ اور اہم واقعات کو ازسرِ نو زندہ کیا ہے بلکہ انھیں اس قدر خوب صورتی سے کہانی کے روپ میں موتیوں سے پرویا ہے کہ یہ ایک حقیقی کہانی معلوم ہوتی ہے۔

افتخار عارف رقم طراز:

> حفیظ خان کے ناول ''انواسی'' کا اردو فکشن میں اپنے دیگر فنی محاسن کے علاوہ ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ

اردو میں سرائیکی وسیب کے پس منظر میں لکھا جانے والا پہلا ناول ہے جو ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک تغیر پذیر تہذیبی اور تاریخی معاشرے کے نشیب و فراز کے بیانیے سے عبارت ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں گزشتہ پچیس برسوں میں جتنے اچھے ناول سامنے آئے ہیں شاید پورے اردو ادب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ناول کے اس عہد میں ''انواسی'' ایک روشن باب کی طرح سامنے آیا ہے۔

رفاقت حیات (''پاکستان میں اردو ناول ۱۹۴۷ء تا حال'' میں) لکھتے ہیں:

> ''انواسی'' میں انگریز حکومت کا دوسرے علاقوں پر قابض ہو کر وہاں کے باشندوں کو اپنا غلام بنانا، ان کے وسائل پر قبضہ کر کے بے دریغ استعمال کرنا، مقامی باشندوں کے ساتھ ناانصافی کرنا اور ان سے جبری مشقت کروانا اور ان کے استحصال جیسے مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ اور دوسری طرف مقامی اشرافیہ میں مولوی جاراللہ جیسے کردار کو بھی موضوع بنایا گیا ہے جس میں سامراج اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اشرافیہ کے تعاون سے اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

''انواسی'' ایک عورت ''سنگری'' کی کہانی ہے جو ڈیڑھ دو سال پہلے کے ہندوستان میں مردوں کے طاقتور معاشرے میں زندہ رہنے کی جنگ لڑتی ہے۔ اپنی عزت و جان بچانے کی خاطر بہت سی سختیاں جھیلتی ہے۔ یہ کہانی ہے دریائے ستلج کی ریتلی تہوں میں گم ہوئے نوآبادتی جبر اور استحصال کی جس میں انگریزوں نے ریلوے لائن بچھانے کے لیے آدم واہن بستی کی باقیات ملیامیٹ کرنے کا فیصلہ کیا تو بستی کے باسی اس فیصلے کے آگے ڈٹ گئے۔ یہیں سے برطانوی استعمار کے ہاتھوں مقامیت برباد ہوئی تو اس خطے میں موجود سنگری جیسے کردار معصوم عورت سے ''انواسی'' ہو گئے۔

مرکزی کردار کے بارے میں محمد حامد سراج کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

> انواسی کون ہے؟ انواسی ایک عورت ہے جو وقت کے ہاتھوں کچلے جانے کے باوجود اپنی بقا کی جنگ اپنے کسے ہوئے کمان بدن، منتقم دل و دماغ اور روح کی سفاکانہ چالوں سے لڑتی رہی۔ یہ ایک غیر معمولی ناول ہے جو ہر عہد میں اپنا قاری تلاش کر لے گا۔ سنگری نام ہے مرکزی کردار کا اور یہی انواسی ہے۔

ناول کا مرکزی کردار ''سنگری'' ہے اور سنگری ہی انواسی ہے۔ انواسی کا مطلب جنسی طور پر کھنگالی ہوئی عورت ہے۔ مصنف نے سنگری کو انواسی کا نام کیوں دیا؟ اس سوال کا جواب تو ناول پڑھنے سے ہی ملتا ہے۔ سنگری، سیدے کی بچپن کی منگیتر ہے۔ سیدا، سنگری کی عصمت دری کے بعد اس کو طلاق دے کر چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد انواسی ایک مزاحمتی کردار کے طور پر سامنے آتی ہے اور اس ڈر سے کہ کہیں معاشرہ اسے بدچلن قرار دے کر سنگسار نہ کر دے مولوی جاراللہ کی چوتھی بیوی بنتی ہے۔ اس شادی کو وہ ایک سمجھوتے کے طور پر لیتی ہے اور ہر اس مرد کا مقابلہ کرتی ہے جو اس کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کرتا ہے۔

ناول کی دوسری اہم کہانی انڈس ویلی اسٹیٹ کے ریلوے چیف ریذیڈنٹ انجینئر جان برنٹن کی ہے جس کے پاس ایمپریس پل کی تعمیر کا کنٹریکٹ ہے۔ یہ ایک انگریز کردار ہے جو استعماری سوچ کا آئینہ دار ہے۔ جو مقامی باشندوں کے سامنے خود کو مسیحا و نجات دہندہ بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس کردار کی ذاتیات کا مطالعہ کریں تو وہ اپنے پیشے کے ساتھ مخلص انسان ہے جو اپنے فرائض کو ہر چیز سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اپنی بیوی کے ساتھ خوشگوار تعلقات نہ ہونے کی وجہ سے اس کی گھریلو زندگی متاثر ہوتی ہے۔ اس کا سوتیلا بیٹا اعلیٰ افسران سے ساز باز کر کے اس کے خلاف سازشوں کے جال بننے لگتا ہے۔ اس پر جونیئر سٹاف میں سے ایک خوب صورت عورت ایما کا جال پھینکا جاتا ہے۔ جس کے ساتھ موج مستیوں کی دلدل میں وہ پھنس جاتا ہے۔ اس طرح کئی نوعیت کے دیگر الزامات ڈال کر اسے نوکری سے نکال دیا جاتا ہے۔ ناول میں جان برنٹن کے علاوہ اس کی بیوی، بیٹا، ایما اور ولیم سینٹ جان گیلوے جیسے دیگر سامراجی سوچ کے انگریز کردار بھی موجود ہیں۔ یہ کردار مقامی باشندوں سے لڑنے کی بجائے یہاں کے جری، بہادر اور دیگر بااثر افراد کو اپنے استعماری حربوں، حکمت عملی اور حسن سلوک سے اپنا بناتا ہے، انھیں نوازتا ہے اور ان کے ذریعے سامراجی اقتدار کو قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

ناول کے دیگر اہم کرداروں میں مولوی جاراللہ، اس کا بیٹا مولوی بخشو، منگر، سنگری کی ماں ملوکاں، جاراللہ کا بھائی اور دیگر معاون کردار موجود ہیں جو مقامیت اور سرائیکی ثقافت کے آئینہ دار ہیں۔ برصغیر کی نوآبادیاتی صورت حال دیکھیں تو نوآبادکاروں نے یہاں کے لوگوں کے ذہنوں میں جو اپنا پہلا امیج بنایا وہ ''مسیحا'' کا تھا۔ جب جان برنٹن مقامی بستی میں پل تعمیر کر کے انھیں ترقی اور خوشحالی کے سنہرے خواب دکھاتا ہے تو کچھ ابن الوقت انھیں ''مسیحا'' سمجھ کر ساتھ دیتے ہیں۔ ان حربوں سے متاثر ہو کر کچھ مقامی کردار استعماری فکر کے مداح ہو جاتے ہیں اور ان کا ساتھ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ محمد حفیظ خان نے ناول ''انواسی'' میں استعماری اور مقامی ثقافت کی کش مکش کو اجاگر کیا ہے۔ یہ کش مکش بعد میں مزاحمت کی صورت حال اختیار کر جاتی ہے۔

''انواسی'' کے مرکزی کردار سنگری اور دریائے ستلج، دونوں کی انواسیت اور ویرانی کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب انگریزوں اپنے نوآبادیاتی مقاصد کے تحت مقامی آبادی سے چند غداروں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور دریا کے کنارے آباد قدیم قبرستان برابر کر کے ریلوے لائن گزار دی، تو وہاں کے فقیروں، بزرگوں اور درویشوں نے آسمان کی جانب شہادت کی انگلی اٹھا کر یوں بددعا دی:

> برباد ہوا ے ستلج کہ جس پر لوہا ڈالنے کے لیے شہدا کا مدفن اجاڑ اگیا۔ برباد ہوا ے ستلج کہ تیرے سبب بے گناہوں کا خون تیری گزرگاہ میں بہا۔ برباد ہوا ے ستلج اس طرح کہ تو خلقت کے واسطے عذاب ثابت ہو۔ رفتہ رفتہ تیری رگوں میں موت اترے، تو بھی بے آب و نشان ہو، تجھ میں کبھی ماس مچھی نہ پیدا ہو، تم پر کبھی پرندے نہ اتریں اور تو ہمیشہ زندگی کے لمس کو بھی ترسے۔

''انواسی'' کے اس اہم سوال پر ڈاکٹر عصمت درانی کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

> ''انواسی''، سیدا، سنگری، منگر، ایما اور جان برنٹن جیسے خوب صورت فرضی کرداروں کے ذریعے حقیقی تاریخی تناظر میں لکھے اس ناول کو روانی بیان، عمدہ اسلوب اور دل چسپ کہانی کے باعث میں نے

حسب عادت ایک نشست میں ہی پڑھا۔اس دل انگیز تحریر کے متعلق اگرچہ بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور لکھا جاتا رہے گا لیکن میری محدود فکر اس ریاست،اس کے عوام اور اس کے دریا کی ویرانی دیکھ کر مصنف کے کیے ہوئے اسی سوال پر آ کر رک گئی ہے کہ کیا واقعی اس دریا،اس کی گزرگاہ اور اس علاقے کو ہمیشہ سے مظالم اور بددعاؤں کا سامنا ہے؟

ناول کے کرداروں بارے ڈاکٹر بی بی امینہ رقم طراز ہیں:

جہاں تک کرداروں کا سوال ہے تو محمد حفیظ کان کا ایک مرد لکھاری ہونے کے باوصف سنگری کی صورت میں ایک مرکزی نسوانی کردار کو ناول کے باقی تمام کرداروں پر حاوی و غالب دکھانا،اگرچہ ایک نیا یا اچھوتا تو نہیں لیکن ایک جرات مندانہ فعل ہونے کے ساتھ ساتھ اس لیے بھی لائق توجہ ہے کہ یہ کردار اپنے مکالموں اور طور طریقوں کے ذریعے عورت کی نفسیات کے جن مختلف پہلوؤں کو بیان کرتا چلا جاتا ہے،ان سے ناول کے واقعات وحالات کی بہتر تفہیم میں مدد ملتی ہے۔

ناول کے آخر میں سیلابی ریلا ایمپریس پل اور بستی کو بہا لے جاتا ہے۔ریت کے ٹیلے پر پانچ دن سے بھوکے اور ژالہ باری سے دھنے ہوئے لوگوں کی وحشت اور خودغرضی عروج پر ہوتی ہے۔بدبو اور تعفن میں ہمدردی کے پھول مرجھا جاتے ہیں۔

محمد حفیظ خان کا اسلوب مقامی زبان کے استعاروں،تشبیہات اور کنایوں بھرپور ہے جس سے سرائیکی وسیب کی خوشبو آتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ ناول برطانوی راج کے عروج کے خدوخال اور بنیادوں کو واضح کرتا ہے اور ہمارے طبقے کی دقیانوسی ذہنیت اور عورت کی ذلت آمیزی کو بھی سامنے لاتا ہے۔''انواسی'' ایسا اہم اور تاریخی ناول ہے جس میں برصغیر کی تاریخ کے ایک انتہائی اہم لیکن نظروں سے اوجھل باب کی روداد ہے جسے پڑھنے کے بعد کئی سالوں تک آپ کو اس کی گونج سنائی دیتی رہے گی۔

❁❁

محسن خالد محسن ❁

اردو غزل کی تشکیلِ جدید میں ہندوستان کے قدیم و جدید شعرا کا حصہ

اُردو غزل بطور صنفِ سخن اوائل سے شعرا کی دلچسپ صنف رہی ہے۔ اُردو زبان کے آغاز میں اسے جو شعرا میسر آئے، انھوں نے اس کی نوک پلک سنوارنے میں اپنا خونِ جگر صرف کیا۔ اس صنف کی خوبی یہی ہے کہ اس کی گردن مارنے والے سیکڑوں آئے اور خاک میں مل گئے لیکن اس کا بال بھی بیکا نہ کر سکے۔ یہ صنف اپنی تمام تر جولانیوں، توانائیوں اور جذباتی رو کے وسیع تر پھیلے سلاسل کے ساتھ ہنوز موجود ہے اور پوری کمک کے ساتھ موجود رہے گی۔

اُردو زبان میں نثر کی نسبت نظم کو شروع سے زیادہ دلچسپی سے لکھا، پڑھا اور محفوظ کیا گیا ہے۔ شعرا نے اوائل میں مثنوی پر توجہ دی، بعد ازاں غزل کی طرف متوجہ ہوئے تو اسی کے ہو کر رہ گئے۔ غزل کی صنف اپنے اندر تمام تر عناصر و لوازمات کا خزانہ رکھتی ہے جو ایک انسان کی جملہ کیفیات و واردات اور تجربات و حوادث کی عکاس ہوتی ہے۔ اُردو غزل نے قریباً آٹھ سو برس کا سفر طے کیا ہے۔ ہزاروں شعرا نے اس صنف کو اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ اس صنف کی خوش قسمتی ہے کہ اسے قلی قطب شاہ سے بہادر شاہ ظفر تک بادشاہِ وقت نے اپنے ہاتھ کا چھالہ بنا کر رکھا اور اس میں اظہارِ ذات کے سبھی مشاہدات و تجربات کو مثلِ نگیں پرُو دیا

اُردو غزل کا سفر کلاسیکی غزل سے مابعد کلاسیکی تک تسلسل سے صدیوں جاری رہا۔ مابعد جدید غزل سے جدید غزل اور جدید سے جدید ترین تک آتے آتے اکیسویں صدی میں ہم داخل ہوتے ہیں۔ غزل کا رنگ و آہنگ اور لب و لہجہ میں مرورِ وقت کے ساتھ بدلاؤ آتے گئے اور اس کا چہرہ مہرہ مزید نکھر کر ترش کر مصفی و منقش ہوا۔

برصغیر کی تقسیم کے بعد دو نئے ملک ہندوستان اور پاکستان نے جنم لیا۔ سرحد کی دیوار حائل ہونے سے سب سے زیادہ نقصان اُردو زبان اور اس کی اصناف کو ہوا۔ زبانیں کسی ملک، قوم اور افراد کی مِلک نہیں ہوتیں۔ اُردو کی یہ بدقسمتی رہی کہ اسے سیاست کی نذر کر کے اِس کے فروغ میں مصنوعی رکاوٹیں حائل کی گئیں جو رفتہ رفتہ دم توڑ گئیں۔ اُردو زبان کے ارتقا اور اس کی جملہ اصناف کا فروغ آج بھی جاری ہے۔ سرحد کی فصیل حائل ہونے کے باوجود دونوں طرف کے شعرا نے اس زبان کی جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔

پاکستان میں جدید اُردو غزل کا مستقبل انتہائی روشن ہے۔ پاکستان میں اس صنف کو ایک سے بڑھ کر ایک شاعر میسر ہے۔ یہی صورتحال ہندوستان میں ہے۔ ہندوستان میں جدید اُردو غزل کو نئے چہرے اور نئی آوازیں میسر آئی ہیں جنھوں نے روایت کو بھی نبھایا اور جدید لب و لہجے اور نئے موضوعات کو بھی غزل کی نازک اور کول لے میں کامیابی سے ڈھالا۔

❁ لیکچرر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ شاہ حسین ایسوسی ایٹ کالج، لاہور۔ رابطہ: ۰۳۰۰۔۴۴۶۳۶۴۰

شاعر چھوٹا بڑا نہیں ہوتا، شاعر کم مشہور یا زیادہ مشہور ہوتا ہے۔ شاعر کو کسی معیار، پیمانے اور کسوٹی پر پرکھا نہیں جاتا۔ اس کا لکھا، کہا اور سنایا ہوا اس کی فکری تموج اور شاعرانہ اُپج کا غماز ہوتا ہے۔ ذیل میں جن شعرا کا انتخاب کیا گیا ہے، ان کے کلام میں وہ گہرائی، گیرائی اور فکری تموج موجود ہے جس سے یہ صنف دیگر اصناف کو منہ چڑاتی دکھائی دیتی ہے۔

اس مضمون میں انتہائی اختصار کے ساتھ ہندوستان میں صنفِ غزل کے قیام ہندوستان کے بعد سے عہدِ حاضر تک کے نمائندہ شعرا کا انتخاب کیا گیا ہے جنھوں نے صنفِ غزل کی تشکیلِ جدید میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس انتخاب میں یقیناً بہت سے مزید اہم شعرا کے نام نہیں آسکے ہوں گے۔ اس کی وجہ مضمون کے اختصار کی تحدید کو ملحوظِ خاطر رکھنا مقصود ہے۔ ذیل میں تجزیاتی جائزہ مع امثال پیشِ خدمت ہے۔

اصغر گونڈوی جدید اُردو غزل کے انیسویں صدی کے ربع ثانی کے صفِ اول کے شاعر ہیں۔ ان کی طبیعت میں صوفیانہ رچاؤ کی شدت نے غزل کو درویشانہ بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد لکھتے ہیں: "اصغر کا متصوفانہ لب ولہجہ انھیں اپنے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کی غزل میں اعلیٰ معیار کی شائستہ زبان مضمون کے کثیر المعنی تناظر میں ڈھلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔"[1]

اُس آستاں سے اُٹھائی نہ پھر جبیں میں نے　　حرم میں سجدہ پیہم تھی ایک دردِ سری

اسیرانِ بلا کی حسرتوں کو آہ کیا کہیے　　تڑپ کے ساتھ اونچی ہو گئی دیوار زنداں کی

ناطق لکھنوی نے کلاسیکی روایت کی تقلید ضرور کی لیکن اپنا جدا رنگ اپنانے کی کوشش بھی کی۔ ناطق نے غزل کو تغزل بنانے کی شعوری کوشش میں زبان کے اصول سے انحراف کیا جس سے خیال کی اثر پذیری میں کمی واقع ہوئی۔ ناطق کے پسندیدہ موضوعات میں اخلاقی اور متصوفانہ فکر کا غلبہ غزل کے مزاج پر حاوی دکھائی دیتا ہے۔

ڈھل گیا عمر کا دن دور میں اب جام آیا　　آفتاب آیا مگر حیف سرِ شام آیا

پھرتے ہیں ڈھونڈتے ہوئے ہر لالہ زار میں　　اک پھول کھو گیا ہے ہمارا بہار میں

مبارک عظیم آبادی قدیم وضع کے شاعر تھے۔ مبارک نے داغ استاد کے رنگ کو عمر بھر اختیار کیے رکھا۔ غزل کے موضوعات میں دنیا کی بے مروّتی، بے حسی اور گلہ و ماتم سرفہرست ہیں۔ مبارک نے غزل کے تخیل پر زور دینے کی بجائے فنی باریکیوں اور فکری تموج سے آشنا کرنے کی شعوری کوشش کی۔

ظلم ہے ترکِ ستم کر کے پشیماں ہونا　　قہر ہے اس پہ ترا سر بہ گریباں ہونا

دام آفریں تھی مرغِ تہِ دام کی تڑپ　　مشکل کو اس نے اور بھی مشکل بنا دیا

جگر مراد آبادی کی شاعرانہ تربیت کلاسیکی اور جدید طرز میں ہوئی۔ ان کے ہاں فکر کی گہرائی اور فن کی اونچائی کا سنگم دکھائی دیتا

ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں: "جگر اس دور کے سب سے زیادہ مقبول اور مشہور غزل گو شعرا میں سے ہیں۔ ان کو لوگ مانیں یا نہ مانیں ان کے کلام پر سر بھی دھنتے ہیں۔"[۲] جگر نے غزل میں تغزل کے عنصر کو غزل کا جزو لازم بنا دیا تھا جس سے غزل کی زبان مزید نکھر گئی اور لطیف و منزہ خیالات کی ترسیل نسبتاً سہل ہوگئی۔

یہ حُسن ہے کیا؟ یہ عشق ہے کیا؟ کس کو ہے خبر اس کی لیکن
بے جام ظہورِ بادہ نہیں، بے بادہ فروغِ جام نہیں

میں جہاں ہوں، ترے خیال میں ہوں
تو جہاں ہے، مری نگاہ میں ہے

فراقؔ گورکھ پوری کا نام بلند آواز میں پکارا جاتا ہے اور ادب و نقد حضرات متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ فراق کی غزل میں فکر و فلسفہ عود کر آتا ہے اور تنہائی کے آگے سرنگوں کیے بیٹھ جاتا ہے۔ فراق نے کلاسیکی روایت کو آٹے پانی کی طرح آمیختہ بنا کر جدید غزل کے سانچے میں سمویا ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں: "فراق کی غزلیں ان کے انفرادی جذبات سے بوجھل ہیں، اس کا اضطراب، سپردگی و معصومیت اور اس کا شعور و آگہی پھوٹ پھوٹ نکل رہی ہے۔ اُنھوں نے حسن و عشق کی کیفیات کو عشقیہ شاعری میں ایک نئی طرز اور آہنگ عطا کیا۔"[۳]

غم و نشاط ترے کس طرح کوئی جانے
ہنسی لبوں پہ نہیں آنکھ بھی پُر آب نہیں

نہیں ہیں پھول تو خاروں کو چھیڑ سکتا ہوں
خزاں میں رفتہ بہاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

پرویزؔ شاہدی کا نام بھی مخدوم کے ہم عصر شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی غزل کا رنگ کلاسیکی ہے۔ ان کے ہاں ترقی پسندی اور سیاسی تغزل کی آمیزش دکھائی دیتی ہے۔ پرویز کی غزلوں میں حسن و عشق کے جذبات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ان کے ہاں جام و مستی اور سرور و انبساط کا تذکرہ کثرت سے ملتا ہے۔

اے دل! کہاں ہے تیری وہ بے باکیِ سخن
کچھ کہہ رہے ہیں بخیہ گرانِ لب و دہن

گلے میں بانہیں ڈال کر منا ہی لیں گی ڈالیاں
گلوں سے روٹھ بھی گئی اگر صبا تو کیا ہوا؟

معین احسن جذبیؔ اُردو غزل کی رویت میں ایک بڑا نام ہے۔ ان کی غزل کا رنگ سیاسی ہونے کے ساتھ ادبیت کی فضا لیے ہوئے ہے۔ ان کے ہاں کلاسیکی رنگ کی آمیزش دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے غزل کو امید کا استعارہ بنایا ہے اور موسیقی کے عنصر کے رچاؤ سے غزل کی حسیت کو شیریں کر دیا ہے۔

اے محبت کیا قیامت ہے کہ تیری راہ میں
ایک دیوانہ خرابِ ہر ستم ہوتا رہے

ہجر کی رات ہے طویل، وصل کی صبح دور ہے
جذبی ابھی ہے ناتمام، خام ابھی شعور ہے

شکیل بدایونی اُردو غزل کی توانا آواز ہے۔ شکیل کی شاعری کا مزاج کلاسیکی ہے۔ ان کے لہجے کا اُتار چڑھاؤ لفظیات کے دروبست سے مہمیز ہوتا ہے۔ جگر کے اسلوبِ شعری سے متاثر تھے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں: "شکیل کی شاعری کا مزاج کلاسیکی غزل نے تیار کیا ہے۔ ان کی شاعری میں بحور، الفاظ اور تراکیب کی بُنت کا عمل مصرعوں کی تراش خراش سے عیاں ہوتا ہے۔"[۴] شکیل کی غزل میں جدت، ندرت اور روانی نے ان کے بعض اشعار کو ضرب المثل بنا دیا ہے۔

یوں ختم داستانِ محبت ہوئی شکیلؔ　　جیسے کوئی حسین غزل گا کے رہ گیا

گمانِ ترکِ وفا ہے ترے تغافل پر　　زمانہ وقت سے پہلے بدلتا جاتا ہے

جان نثار اخترؔ نے غزل کو غزل ہی رہنے دیا ہے۔ ان کی غزل میں کلاسیکی اور جدت کی آمیزش نے رومانوی لب و لہجے کو تازگی بخشی ہے۔ نثار کے ہاں واقعیت اور اپنایت کا احساس باہم مدغم صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ نثار نے غزل میں تغزل کے عنصر کو برتنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ ان کی نظموں میں بھی اسی رنگِ سخن کی گہری چھاپ موجود ہے۔

یارو اپنے عشق کے قصے یوں بھی کم مشہور نہیں　　کل تو شاید ناول لکھے جائیں، ان رومانوں پر

ایک بھی خواب نہ ہو جن میں وہ آنکھیں کیا ہیں　　اک نہ اک خواب تو ان آنکھوں میں بساؤ یارو

شمیم کرہانی نے غزل کو جذباتی رو کے متوازی قلبی حدت کے انفعالی تاثر میں رکھ کر دیکھا ہے۔ شمیم نے الفاظ سے تاریخی شعور کا کام لیا ہے۔ زبان سادہ مگر فکر اتھاہ گہرائی کی حامل ہے۔ شعر پڑھتے ہوئے شعر کے سیاق سے ذہن الجھتا محسوس ہوتا ہے۔

یہ دل فریب چاند ہے کہ نیم جاں چکور　　یہ موت کا سکوت ہے کہ زندگی کا شور

لرز رہے ہیں ستارے کہ اس زمین پہ ہم　　تلاشِ جادہ شمس و قمر کو نکلے ہیں

نشورؔ واحدی اسی عہد کا ممتاز شاعر ہے جس کے ہاں غزل واقعی ایک جاندار اظہار کا پیرایہ بن گئی ہے۔ نشور نے ریاض خیر آبادی کے شعوری تتبع میں خمریہ موضوعات پر لکھا اور اس میں اضافہ کیا۔ رندانہ تجربات کو غم کی لے سے ملفوف کر کے غزل کے ذائقہ کو بقول فراز شراب کو شرابوں میں ملا کر نشہ بڑھایا۔ ترنم اور درد اور موسیقی کا سنگم نشور کی غزل کا حسن اعجاز ہے۔

عشق پُر نیرنگ تیری بے مثالی ہے عجب　　عجز کا پہلو بھی داخل ہے ترے اعجاز میں

نہیں معلوم دل کھو کر پھر اپنا حشر کیا ہوگا　　جہاں تک دل ہے اُن کی مہربانی ہوتی جاتی ہے

مجروحؔ سلطانپوری اُردو غزل کے نمایاں شاعر ہیں جنھوں غزل کو مشاعروں سے نکال کر پردے پر یعنی فلم انڈسٹری میں پہنچایا۔ مجروح کی غزل میں کلاسیکی روایت کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے غزل کی نزائیت کو صرفِ نظر نہیں کیا بلکہ زبان کی حلاوت کو

جذبے کی لطافت کے ساتھ مدغم کر کے غزل کی مجموعی صورت کو بیان کا مرقع بنا دیا ہے۔ پروفیسر محمد حسن نے لکھا ہے: "مجروح نے غزل کو جدید اسلوب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ہاں عہد جدید کی امیجری اور آراستگی کا بیان کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا ہے۔"(۵)

جگائیں ہم سفروں کو، اُٹھائیں پرچم شوق جو خار راہ کو بھی شمع رہگذار کرے

راس آئے تو ہے چھاؤں بہت برگ و شجر کی ہاتھ آئے تو ہر شاخ ثمر ریز بہت ہے

کیفی اعظمی کا نام ہر حوالے سے اُردو ادب میں باقی رہے گا۔ کیفی کی فلمی دنیا میں خدمات اپنی جگہ۔ ان کی شاعری کا قد ان کے ہمعصر میں نسبتاً اونچا ہے۔ کیفی نے غزل میں جدید لب و لہجے کو ابھارا اور اپنے فکری میلانات سے غزل کے سانچے کو از سرِ نو تشکیل دیا۔ ڈاکٹر مظفر حنفی لکھتے ہیں، ''کیفی کے اشتراکی نظریات کا درجہ عقیدت مندانہ ہے مگر ان کی غزل کا رنگ ایمائیت کے فلسفے کے گرد گھومتا ہے۔"(۶)

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی

ابھی کھلیں گے نہ پرچم، ابھی پڑے گا نہ رن کہ مشتعل ہے مگر متحد نہیں ہے وطن

کمار پاشی کی نظموں کے آگے ان کی غزل کا چراغ نہ جل سکا۔ انھوں نے نظم میں شہرت حاصل کی تاہم ان کی غزل بھی توجہ کا تقاضا کرتی ہے۔ کمار نے معاشرتی تنزل کو انسان کی بے حس طبیعت کے پیش نظر اجتماعی احتجاج بنا کر پیش کیا ہے۔ اخلاقی تموج کی ناہمواری اور تہذیبی گراوٹ کی گھمبیر کش مکش ان کی غزل کا ما حصل ہے۔ کمار نے انسانی جذبات کو بے توقیر ہوتے دیکھ کر سر پہ دھول ڈال کر ماتم کیا ہے۔

ٹوٹ کر تارے گرے کل شب مری دہلیز پر اُس کی بھی آنکھیں گئیں اور میں بھی اندھا ہو گیا

ہم یہ کیا جانیں کہ کیوں صبر و سکوں جاتا رہا تو جو اک دن پاس آ بیٹھے تو سمجھائے ہمیں

بیدل حیدری کی غزل کا رنگ کلاسیکی مزاج لیے ہوئے ہے۔ بیدل نے غزل کے کینوس کو علامتوں، محاکات اور استعاروں سے سجایا ہے۔ ان کا ذاتی مشاہدہ تجربے کی بھٹی سے کندن ہو کر مصرعوں میں ڈھلا ہے۔ شعر کہنے کے فن سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اپنے عہد کے عصری مسائل کی تصویر کشی میں ماہر ہیں۔ غزل کے رنگ کو تکرار لفظی سے پھیکا نہیں پڑنے دیا۔

اُس کا پیکر مری سوچوں نے تراشا کیسے محوِ حیرت ہوں قریب اتنا وہ آیا کیسے

چھوڑ کر دھوپ گلی میں مرا سایہ مجھ کو اس کی دیوار سے لپٹا ہے تو کتنا خوش ہے

مظہر امامؔ نے غزل کی صنف میں تجربات کیے اور ''آزاد غزل'' کا تجربہ ان سے منسوب ہو کر رہ گیا۔ مظہر نے غزل کے کینوس کو وسعت دینے کے لیے اس کے عروضی نظام سے انحراف کیا۔ آل احمد سرور نے لکھا: "مظہر امام نے ترقی پسندی کے زیرِ اثر جدیدیت کو غزل میں شامل کرنے کی کوشش کی جس میں یہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔"

جتنے پتے تھے، سب ہی ہوا دے گئے　　کس پہ تکیہ رہا ہے ترے شہر میں

تجھے اے ہم سفر! کیسے سنبھالوں　　بھٹکتا راستہ ہے اور میں ہوں

جگن ناتھ آزادؔ کی شاعری ان کے تنقیدی و تحقیقی کام کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے دب سی گئی لیکن اسے نظر انداز ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ جگن نے غزل کو انسانی موضوعات کے محدود دائرے سے باہر نکال کر آفاقیت سے متصل کیا۔ ان کے ہاں ہجر و وصل اور یاس و نراس کی ملی جلی کیفیت نظم و غزل میں برابر ملتی ہے۔ حیات و کائنات سے دلچسپی کا عنصر واضح دکھائی دیتا ہے۔ سید عقیل رضوی لکھتے ہیں: "آزاد کا آہنگ ان کی شاعرانہ شخصی وصف کا پتا دیتا ہے۔ آزاد نے غزل کو ماورایت اور ملکوتی فضا میں تعمیر کرنے کی بجائے اس کی نیو زمین سے اُٹھائی ہے۔"(۷)

گم ہو چکی ہے کاہکشاں گردِ راہ میں　　اب دیکھیے ہو ختم ہمارا سفر کہاں

مجھے ہر اک قدم پر سابقہ تھا تازہ محفل سے　　مجھے ہر اک قدم پر یاد تیری انجمن آئی

آنند نرائن ملاؔ کا شعری سفر دلچسپی آہنگ لیے ہوئے ہے۔ نرائن نے کلاسیکی اساتذہ کے رنگِ سخن سے خوب استفادہ کیا۔ ان کی غزلوں میں متانت، سنجیدگی اور سلیقہ شعاری کا خاص اہتمام دکھائی دیتا ہے۔ عصرِ حاضر کی تابناکی اور توانائی کی حدت بھری فضا قاری کو متوجہ کرتی ہے۔ سادہ اور آسان زبان میں دل پہ گزری اور بدن پہ سہی واردات کو بیان کرتے ہیں۔

تری جفا کو جفا میں تو کہہ نہیں سکتا　　ستم ستم ہی نہیں ہے جو دل کو راس آئے

آدابِ محبت بھی ہیں عجب دو دل ملنے کو راضی ہیں　　لیکن یہ تکلف حائل ہے پہلا وہ اشارا کون کرے

قابلؔ اجمیری نے اُردو غزل کو چونکانے والا لہجہ دیا ہے۔ قابل کی لفظیات شعوری حسیت اور گہری رمزیت سے بھری ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا: "قابل اجمیری کی شاعری پڑھنے سے اس کی سوجھ بوجھ اور فنی دسترس کا پتا چلتا ہے۔ شعری کہنے کی فطری صلاحیت قابل کی شاعرانہ اُپج کا واضح ثبوت ہے۔ قابل نے سہل ممتنع کو حقیقی معنوں میں غزل کا ہمرکاب بنایا ہے جس سے شعر کی حسیت اور بڑھ گئی ہے۔"(۸)

تمھیں چشمِ مخمور پر ناز کیوں ہے　　یہ خوابِ بہاراں تو ہم دیکھتے ہیں

دل دیوانہ عرض حال پر مائل تو کیا ہوگا　　مگر وہ پوچھ بیٹھے خود ہی حالِ دل تو کیا ہوگا

علی جواز زیدی نے ''دو ادبی اسکول'' لکھ کر اُردو غزل کی لکھنوی اور دہلوی روایت کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ علی جواز خود ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کے ہاں دل کی دھڑکن کو سینے پر ہاتھ رکھے بغیر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انسانی کرب کی تمام سطحیں علی جواد کے ہاں آہ بن کر ابھرتی ہیں۔ سچائی اور صداقت کے اس پیکر نے غزل کو حسن وصداقت کا مرقع بنا دیا۔

ایسی تنہائی ہے اپنے سے بھی گھبراتا ہوں میں　　جل رہی ہیں یاد کی شمعیں بجھا جاتا ہوں میں

اب درد میں وہ کیفیتِ درد نہیں ہے　　آیا ہوں جو اس بزم گل افشاں سے گزر کے

شہاب جعفری نے ماورائی موضوعات کو طلسمی انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی غزل میں فطرت کے سبھی رنگ جلوہ گر ہیں۔ شہاب نے علامتوں اور تمثیلوں سے اپنے عہد کی مخصوص مخدوش صورتحال کا نقشہ کھینچا ہے۔ احتشام حسین نے لکھا: ''شہاب کے ہاں علامتوں کی تجریدیت سے معنوی حسن پیدا ہوا ہے جو غزل کے امکانات کو روشن کرتا ہے۔''(۹)

زندگی غم ہی سہی، غم بھی ہمارا نہ رہا　　اب محبت کا ہمیں کوئی سہارا نہ رہا

مٹی کریدتے ہیں ہر اک رہگذر کی ہم　　اے زندگی کہاں تری جاگیر کھو گئی

اشہر ہاشمی کے ہاں بھی روایت سے استفادہ کا رجحان دکھائی دیتا ہے۔ اشہر نے نظم میں اپنے افکار کا بیانیہ جدت پر جبکہ غزل میں کلاسیکی اُسلوب پر رکھا ہے۔ اشہر کے ہاں سماجی وسیاسی اور تہذیبی انحطاط کی گرواٹ کا شدید ردِعمل ملتا ہے۔ اشہر کی غزل میں سطحیت کم اور داخلی ورود زیادہ ملتا ہے۔

راکھ کے اندر چنگاری ہے، یہ کیا جانتے ہم　　خشک لبوں کا تم پلکوں سے رشتہ جانتے ہم

تیرے بنا جینے کا سلیقہ بھی ہے لیکن　　جینے کے لیے تیری ضرورت تو بہت ہے

سُرور بارہ بنکوی نے اُردو غزل کو سہل ممتنع کے دلآویز لہجے سے مزین کیا ہے۔ سرور کے عہد میں ان سے بڑا گہری بات کو آسان تر الفاظ میں کہنے والا کوئی نہ تھا۔ حقانی القاسمی لکھتے ہیں: "سرور نے اُردو غزل کو تجربے کی لفاظی گرفت سے آشنا کروایا ہے۔"(۱۰)

مرے روز و شب یہی ہیں کہ مجھی تک آ رہی ہیں
ترے حُسن کی ضیائیں کبھی کم کبھی زیادہ

وحید اختر کا طرزِ کلاسیکی غزل کی معنویت کو دو چند کرنے کا مسبب بنا۔ وحید نے نظم میں بھی کلاسیکی روایت کو باخوبی نبھایا۔ وحید کے ہاں عصری حسیت کی پیش کش کا نظام جدیدیت کے تصور سے متصل دکھائی دیتا ہے۔ مشاہدات وتصورات کا بیان ان کی تجربہ گاہ سے وارد معلوم ہوتا ہے۔ وحید نے الفاظ کے نت نئے استعمالات کے متنوع پہلو غزل کے سانچے کو بنیاد فراہم کرنے کے لیے تراشے۔

دوستی اُن سے بھلا کیسے نباہی جائے　　جو گریزاں ہیں مگر ہونٹوں پہ انکار نہیں

کوئی گلی،کوئی گھر،کچھ سراغ تو ہوگا　　کہ گم ہے دل،مگر اب ایسالاپتا بھی نہیں

مخمورؔ سعیدی جدید اُردو غزل کا ایک جانا پہچانا نام ہے۔مخمور نے غزل کی تنگ دامانی کو اپنے رومانوی خیالات سے وسعت دینے کی کوشش کی۔ان کی غزل میں محبت مرکزی موضوع کی حیثیت سے موجود ہے۔وجود کی اذیت سے متصل کش مکش کا تجرباتی انحطاط مخمور کی غزل میں نہایت سلیقے سے بیان ہوا ہے۔

ہے مری حدِ رسائی تک مری پہچان کچھ میں　　جہاں تک جا نہیں سکتا،وہاں میں کون ہوں؟

ہم بھی اپنے روز و شب کے ہیں اسیر　　وہ بھی کچھ حالات سے مجبور ہے

کرشنؔ بہاری نور نے اردو غزل کو ایک نیا سانچہ دیا جو روایت سے ہٹ کر تھا۔مشکل یہ تھی کہ اس تغزل سے لبریز سانچے میں کسی اور شاعر کو شعر کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔کرشن کے ہاں کلاسیکی روایت کے استفادے کے ساتھ اپنی لفظیات کو مخصوص علامتی تلازموں کے ساتھ آمیختہ کرنے کی خداداد صلاحیت میسر تھے جس سے انھوں نے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔کرشن بہاری کی غزل کا تخلیقی سفر اُردو غزل کے ارتقا کی ایک اہم کڑی ہے۔

نہ کوئی سمت نہ جادہ نہ منزلِ مقصود　　یگوں یگوں سے یونہی بے رخی کی قید میں ہوں

ادھورے خوابوں سے اُکتا کے جس کو چھوڑ دیا　　شکن نصیب وہ بستر مری تلاش میں ہے

ظہیرؔ غازی پوری نے غزل کی کلاسیکی روایت کو تھامے رکھا۔شعر عمدہ تراشتے ہیں۔نظم کی دوڑ تخیل کے اسپ کے سپرد رکھتے ہیں۔غزل لو بندھے ٹکے اصول سے ذرا منحرف نہیں ہونے دیتے۔زبان پر گرفت نے مضمون کی ادائی کو سہل اور رواں بنا دیا ہے۔جستجو اور کھوج کے عمل سے مسلسل غزل کا ارتقا ہونا ان کے شعری سفر میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اپنے ہی عکس تھے۔ دُھندلے شاید　　آئینے تو نہ تھے اندھے شاید

کوئی منصور مرے جسم کے اندر بھی ہے　　میرا انجام مجھے پھر سے بتا دو یارو

محمد علویؔ کی غزل کا سادہ مزاج اور سہل انداز غزل کے قاری کو بہت بھایا۔محمد علوی نے اپنے اُردو گرد کی دنیا کو قدامت کی زنجیروں سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔ان کے ہاں رسم و رواج اور اونچ نیچ کے تصورات سے بیزاری اور رہائی کا تاثر واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا:"انسانی مزاج کے متنوع پہلوؤں کو محمد علی نے اس طرح شعر کے سانچے میں پرویا کہ اس کی ثانی مثال نہیں ملتی۔"(۱۱)

دن بھر کے دہکتے ہوئے سورج سے لڑا ہوں　　اب رات کے دریا میں پڑا ڈوب رہا ہوں

دیکھا نہ ہوگا تو نے مگر انتظار میں　　چلتے ہوئے سمے کو ٹھہرتے ہوئے بھی دیکھ

بشیر بدرؔ کا فنی سفر ساٹھ برس کو محیط ہے۔ کومل، نرل اور گداز جذبوں کو بشیر نے عام فہم یعنی بول چال کے انداز میں بیان کر کے ان جذبوں کی توقیر میں اضافہ کیا۔ بشیر کا فنی سفر جاری ہنوز جاری ہے۔ ان کی غزل میں ہندوستانی سماج اور تہذیب سے متصل اندیشوں اور توقعات کا بیانیہ پُراثر انداز میں ملتا ہے۔ بشیر نے غزل میں موسیقی کے عنصر کو خوب رچاوٹ کے ساتھ مدغم کیا ہے۔

اک پل کی زندگی مجھے بے حد عزیز ہے　　پلکوں پہ جھلملاؤں گا اور ٹوٹ جاؤں گا

لوبان میں چنگاری جیسے کوئی رکھ جائے　　یوں یاد تری شب بھر اس سینے میں جلتی ہے

سمپورن سنگھ (گلزارؔ) اُردو زبان و ادب کا قابلِ فخر حوال ہیں۔ گلزار نے اردو فلمی دنیا کو ناقابلِ فراموش نغموں اور اسکرپٹ سے نوازا۔ گلزار کی نظمیں، غزلیں، تروینیاں اور قطعات ان کی یادگار ہیں۔ گلزار کا تخلیقی سفر ہنوز جاری ہے۔ گلزار نے امیجری اور پیکر تراشی کو تشبیہات واستعارات کی زبان میں جس طرح آشکارا کیا وہ ان پر ختم ہے۔ گلزار کی زبان، اظہار، اسلوب، پیش کش سمیت تخلیق کا ہر عمل متاثر کن ہے۔

عمر بھر موت کے تعاقب میں　　زندگی سنگرام کرتی ہے

جیے جاتے ہیں، جیے جاتے ہیں　　عادتیں بھی عجیب ہوتی ہیں

شین کاف نظامؔ عہدِ حاضر کی غزل کا بڑا نام ہے۔ شین کاف نے غزل کے جملہ اسالیب میں طبع آزمائی اور تخیل کی جولانیوں سے عجب وضع کے مضامین نکالے۔ شین کاف کے ہاں غضب کی سادگی اور پُراثر لہجے کی حدت پائی جاتی ہے۔ برجستگی اور روانی ان کی غزل کا خاص وصف ہے۔

کوئی آواز نہ پیغام نہ جذبوں کا جھکاؤ　　کس لیے کس کے لیے پھر میں پلٹ کر دیکھوں

اب بام و در کا سرد بدن چاٹتی ہے دھوپ　　زینوں کو پار کر کے کہاں آگئی ہے دھوپ

انیسؔ انصاری نے عمدہ غزل کہی۔ ان کے ہاں موضوعات کی تکرار ملتی ہے لیکن خیالات میں تنوع موجود ہے۔ شعر کا خارجی رنگ اچھوتا اور دلکش ہے جبکہ داخلی رنگ سطحی اور معمولی محسوس ہوتا ہے۔

تو، تو اس وقت کہیں وقفِ مسرت ہوگی
مجھ کو معلوم ہے یہ لمحۂ راحت ہے تیرا

راحتؔ اندوری نے اُردو غزل کو فیض احمد فیض کی طرح سیاست و معاشرت کا احتجاجی علم بنایا۔ راحت کے ہاں وطن سے محبت اور دھرتی کی مقدس روایات سے بگاڑ میں کارفرما عناصر کے خلاف شدت اپنی انتہا کو پہنچی نظر آتی ہے۔ راحت اکیسویں صدی کے بھارت کے مقبول ترین شعرا میں سرفہرست تھے۔ ان کا غزل کا رنگ تیکھا، نوکیلا اور چبھن پیدا کرتا ہے۔ رومانوی مضامین کے بیان میں اپنا خاص انداز رکھتے ہیں۔ مشاعرہ کے کامیاب شاعر تھے۔

زندگی کا کوئی بھی تحفہ نہیں ہے میرے پاس　　خون کے آنسو تو غزلوں کے حوالے کر دیئے

جن چراغوں سے تعصب کا دُھواں اُٹھتا ہے　　ان چراغوں کو بجھا دو تو اُجالے ہوں گے

پروفیسر وسیمؔ بریلوی عہدِ حاضر کے کہنہ مشاق شاعر ہیں جنھوں نے غزل کو اس کی اپنی زبان میں اظہار کا ذائقہ چکھایا۔ وسیم نے سادہ، آسان اور سہل انداز میں زندگی کے تلخ و شیریں تجربات و حوادث اور سانحات کو پیش کیا۔ شعر کہتے ہیں گویا دل سے بات دل میں اُتر جاتی ہے۔

یہ لگ رہا ہے کہ ہر زخم بھر ہی جاتا ہے　　یہ کن لبوں پہ مرے دل کی داستان گئی

غم میں یوں ڈوبے ہوئے ہم تری محفل سے چلے　　جیسے اک راہ کسی پیار کی منزل سے چلے

جاویدؔ اختر مشہور نغمہ نگار، اسکرپٹ رائٹر اور جانے کیا کیا ہیں۔ ان کی شخصیت اُردو شعر و ادب کا معتبر حوالہ ہے۔ جاوید کی غزل کا رنگ سب سے مختلف ہے۔ طویل بحر میں موضوع کو ایسے تحدید میں لاتے ہیں کہ کہیں کوئی نقص باقی نہیں رہتا۔ ان کے لکھے ہوئے گیت، اشعار اور گفتگو میں پیش کیے اقوال و نکات پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ جاوید نے اُردو غزل کے جدید ترین لب و لہجے کو کلاسیکی رنگ سے پینٹ کر کے اس کے حُسن کو تابانی و فروزنی بخشی ہے۔

دل بجھا، جتنے تھے ارمان سبھی خاک ہوئے　　راکھ میں پھر یہ چمکتے ہیں شرارے کیسے

جھکا درخت ہوا سے، تو آندھیوں نے کہا　　زیادہ فرق نہیں جھکنے،ٹوٹ جانے میں

شارقؔ کیفی قد آور شاعر ہیں۔ شارق نے نظم و غزل میں طبع آزمائی کی اور اپنے عہد کے مقبول اور ممتاز رجحان ساز شاعر قرار پائے۔ شارق نے انسانی معاملات سے متصل جملہ جذبات کو ایک خاص انداز میں اظہار دیا ہے جو ان کی اُردو غزل کو خاص دین ہے۔ شارق نے رومانس کی معنویت کو جملہ افکار کے فلسفے میں تحلیل کر کے دیکھا ہے۔

جان دینے کا وقت آہی گیا　　اس تماشے کے بعد فرصت ہے

نیند اب آنے ہی والی ہے مجھے　　اب جنوں کم ہونے والا ہے مرا

فرحت احساس عصر حاضر کے ممتاز شاعر ہیں جنھوں نے سنجیو صراف کے ہمراہ "ریختہ" اپنی ویب سائٹ کو متعارف کروانے میں اپنا کلیدی کردار ادا کیا۔ ان کا شعری منظر نامہ کائناتی وسعت کا حامل ہے۔ غالب و میر و داغ و ناصر کا لب و لہجہ ان کے ہاں ایک آواز بن کر ابھرا ہے۔ ان کی غزل میں حسن وعشق کا رعب دار بیان ہے جس میں سمجھوتے کی لہجہ تلخ کی ادا دکھائی دیتی ہے۔ الفاظ سے کام لینے کا ہنر انھیں خوب آتا ہے۔

تجھے خبر ہو تو بول اے مرے ستارہ شب
مری سمجھ میں تو آتا نہیں اشارہ شب

عالم خورشید عمدہ غزل گو ہیں۔ ان کی غزل کا رنگ جدید معنویت کے ساتھ کلاسیکی رنگ سخن کا پیرو نظر آتا ہے۔ عالم نے تجرید و تجسیم کی اضداد کو باہم متشکل کرنے کی تمثالی تجربہ کاری کی ہے جس سے شعر کی تفہیم الجھ جاتی ہے۔

ترے خیال کو زنجیر کرتا رہتا ہوں میں اپنے خواب کی تعبیر کرتا رہتا ہوں

کچھ رستے مشکل ہی اچھے لگتے ہیں کچھ رستوں کو ہم آسان نہیں کرتے

عطا عابدی نے تحقیق وتنقید میں زیادہ وقت گزارا۔ شعر نسبتاً کم کہے لیکن عمدہ کہے۔ کسی ایک موضوع پر مستقل اپنی رائے کا اظہار نہ کر سکے۔ جو، جی میں آیا پختہ اور رواں ہونے سے قبل احاطہ تحریر میں لے آئے جس سے شعر کا رنگ پھیکا اور بے سواد ہو گیا ہے۔

کبھی تو رخ شب غم کا کرو ادھر کو بھی نشاط صبح سے اب رشتہ اپنا جوڑو بھی

کبھی نہ کھل کے ملا وہ نصیب کیسا تھا قریب تھا مرے لیکن قریب کیسا تھا

نعمان شوق "ریختہ" فاؤنڈیشن سے وابستہ عہد حاضر کے عمدہ شاعر ہیں۔ سماج میں ہونے کے بدلاؤ اور عالمی تغیرات پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ شعر میں ردعمل کا رجحان ملتا ہے۔ ظلم وستم کی ناؤ کو اپنے مخالف بہتے دیکھ کر تیغ پا ہو جاتے ہیں۔ حسن میں قناعت کے قائل ہیں۔ جذباتی نہیں ہوتے۔

یہ سارے زخم مجھے آگہی نے بخشے ہیں خبر کے پاس مرا اندمال کچھ بھی نہیں

میں اپنے سائے میں بیٹھا تھا کتنی صدیوں سے تمھاری دھوپ نے دیوار توڑ دی میری

خالد محمود کی غزل دبستان لکھنؤ کی قدیم روایت کا تتبع کرتی دکھائی دیتی ہے۔ خالد نے اپنے مخصوص تخیلی افکار کو تغزل کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ خالد کے ہاں تجربے سے اخذ معنویت کا گہرا تاثر شعر کی نہت تاثر چھوڑتا دکھائی دیتا ہے۔ رشتوں کی گراوٹ کا کرب خالد نے براہ راست محسوس کیا ہے۔

سنگِ دُنیا پکارا جا رہا ہے ہر اک جانب اشارا جا رہا ہے

شکوہ کروں کہ شکر کروں آسمان کا سر پر نہیں گرا مرے چھپّر مکان کا

سراجؔ اجملی کا شمار عمدہ غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ سراج نے غزل میں فکر کی گہرائی کو تمثیلی پرتو میں قدرے سنجیدہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی آواز میں ایک ٹھہراؤ اور اپنا پن ہے جو سطحی خیال کو بھی دلآویز بنانے کا کام کرتا ہے۔

یہ جو تصویر میں اشکوں کی فراوانی ہے غم نہیں ہے یہ کوئی اور پریشانی ہے

اب اور کیا نگہِ بے نیاز میں کم ہو یہ مشتِ خاک کہ پہلے سے ہے بہت ارزاں

رسولؔ ساقی نے فکر و خیال کی آمیزش سے زبان کی نزاکتوں اور تلازموں کا بھرپور استعمال کیا۔ رسول کی غزل کا استعجابی رنگ پڑھنے والے پر اپنے افکار کی تابنا کی واضح کرتا ہے۔ شعر میں تشکیک کا عنصر موجود ہے۔ تازگی اور برجستگی کے ساتھ روانی بھی موجود ہے۔

وہ میری دشمنی کا سامنا کر بھی نہیں سکتا وفا کے نام پر کر لے وہ جتنا جور کرتا ہے

مرے سب خواب پانی ہوگئے ہیں مگر آنکھوں سے بہتا کچھ نہیں ہے

نوشادؔ احمد کریمی کی غزل کا تحقیقی رنگ شعری تاثر کو زائل کرتا ہے۔ نوشاد نے سماجی تنزل کے یاسیت زدہ ماحول میں امید کی شمع جلائی ہے۔ الفاظ سے تجسیم کاری کرتے ہیں اور ذاتی تجربوں کو داستانی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ زبان پر گرفت ہے، عمدہ شعر نکال لیتے ہیں۔

چراغِ عجز بہ دستِ خلوص جل نہ سکا کہاں سے ہوتی فلک پر مری دُعا روشن

میں لکھ رہا ہوں غم کی کہانی ورق ورق ٹپکا قلم سے آنکھ سے پانی ورق ورق

ظہیرؔ رحمتی عہدِ حاضر کے عمدہ غزل گو شاعر ہیں۔ ان کے کلام کی فنی پختگی وسیع مشاہدے کی دین ہے۔ تجربے کو سامنے نہیں لاتے مشاہدے سے سماج کے دوہرے معیار کو پرکھتے ہیں۔ رشتوں ناتوں اور تعلق داریوں کی منافقت اور کھوکھلی معاشرت کو بے باکی سے بیان کرتے ہیں۔ شعر میں کائناتی آفاقی محسوس ہوتی ہے۔

یہ کس نے طاق میں آنکھوں کی سرخیاں رکھ دیں کہ روشنی میں شب انتظار ختم ہوئی

زمانے بھر کو ہے اُمید اُسی سے وہ نا اُمید ایسا کر رہا ہے

شہپر رسول کی غزل تلازموں اور صوتی اشاروں سے اظہار کے وسیلے تلاشتی ہے۔ شہپر نے علامتوں کا استعمال کیے بغیر غزل کو علامتی اندازِ تکلم بخشا ہے۔ الفاظ سے دلچسپی نے ان کی غزل کو نگار خانہ بنا دیا ہے۔ اپنی مرضی سے تخیل کو لگام ڈال کر موزوں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وہ برہمی کی جو اک داستاں تھی ختم ہوئی
اسے کہو کہ وہ اُس سے وہ بات اب نہ کرے

منور رانا کی شاعری میں ایک جہان آباد ہے۔ منور نے اپنی غزل کو سماجی اقدر سے انحراف کے رویئے کے خلاف مرکوز کر رکھا تھا۔ ماں کا تصور ان کی شاعری کا مرکزی نکتہ ہے۔ منور نے اپنا منفرد اسلوب وضع کیا اور خوب غزل کی زلفیں سنواریں۔ منور کا شعری سفر پچاس برس پر محیط ہے۔ شعری حسیت اور مشاہدے کی گہرائی منور رانا کی غزل کو آفاقی بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

سیلاب کا پانی کبھی روکا نہیں جاتا　　کیوں راستہ تُو دیدۂ تر کاٹ رہا ہے

ہم غریبوں میں چلے آئے بہت اچھا کیا　　آج تھوڑی دیر کو گھر میں اُجالا ہوگیا

لیاقت جعفری پونچھ کشمیر سے متصل ممتاز عہدِ حاضر کے شاعر ہیں۔ ان کی غزل کا رنگ احتجاجی ہے جو کشمیر کی صورتحال سے مشروط ہے۔ لیاقت نے غزل کو وسیع تناظر میں برتا ہے۔ ان کی اپنی لفظیات اور خاص اسلوب ہے جس سے گہری کاٹ دار حسیت کو شعر کے پردے میں قاری تک احتجاج کی صورت پہنچاتے ہیں۔ کرب و درد و نارسائی اور بے بسی کی اتھاہ میں غرق امید کو اچھالنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

وجود اپنا ہے اور آپ طے کریں گے ہم　　کہاں پہ ہونا ہے ہم کو کہاں نہیں ہونا

میں کچھ دن سے اچانک پھر اکیلا پڑ گیا ہوں　　نئے۔ موسم میں اک وحشت پرانی کاٹتی ہے

معین شاداب مشاعرے کی نظامت کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں۔ معین کی شاعری کا رنگ مقلدانہ ہے۔ انفرادیت کی کمی ہے البتہ شعر عمدہ کہنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ شعر کی شعریت سے زیادہ شعر کے خارج پر دھیان دیتے ہیں۔

ذرا سی دیر کو تم اپنی آنکھیں دے دو مجھے　　یہ دیکھنا ہے کہ میں تم کو کیسا لگتا ہوں

بہت سے درد تو ہم بانٹ بھی نہیں سکتے　　بہت سے بوجھ اکیلے اٹھانے پڑتے ہیں

خوشبیر سنگھ شاد غزل کا بڑا نام ہے۔ شاد کے ہاں غزل کے ارتقا کا تسلسل نظر آتا ہے۔ شاد نے غزل میں حسن وعشق کے ساتھ سماجی شعور کی پرتوں کو کھولا ہے اور ممنوعہ موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔ ان کے ہاں سماجی انحرافات اور اخلاقی اقدار کی گراوٹ کا تنزل دکھائی دیتا ہے۔

ترے قد تک پہنچنے کی ہوس میں ۔۔۔۔۔ میں اپنے قد سے کم تر ہو گیا ہوں

تجھ سے بچھڑ کے غم کی شدت سمجھ رہا ہوں ۔۔۔۔۔ اب تیرے آنسوؤں کی قیمت سمجھ رہا ہوں

امیر امام نوجوان شاعر ہیں۔ ہندوستانی غزل کی مشترکہ تہذیب کی نمائندہ آواز ہیں۔ ان کی لفظیات اور موضوعات میں گہرا تضاد ہونے کے باوجود اتصال کی ایک گہری رمزیت پائی جاتی ہے۔ شعر کا آہنگ احتجاجی ہونے کے باوجود گداز اور نرمی محسوس ہوتا ہے۔ انسانی جذبات کے بیان کا عمدہ سلیقہ آتا ہے۔ شعر کہتے ہوئے ہوئے ریاضت کا دامن نہیں چھوڑتے۔

محسوس کر رہا ہوں خاروں میں قید خوشبو ۔۔۔۔۔ آنکھوں کو تری جانب اک بار کر لیا ہے

وہ جو آدمؑ کو بلا لائی تھی جنت سے یہاں ۔۔۔۔۔ یار ہم بھی اُسی مٹی کے پکارے ہوئے ہیں

ابھیشک شکلا نئی نسل کے ممتاز شاعر ہیں۔ ان کی ادب اور تہذیب کے جملہ مظاہر پر گہری نظر ہے۔ نوجوان شاعر ہونے کے باوصف ابھیشک نے غزل کو ایک سنجیدہ فن کار کی طرح برتا ہے۔ ابھیشک نے زندگی کے نشیب و فراز کے حوادث و معاملات کو غزل کی زبان بنایا۔ عمدہ شعر نکالتے ہیں۔

تیری آنکھوں کے لیے اتنی سزا کافی ہے ۔۔۔۔۔ آج کی رات مجھے خواب میں روتا ہوا دیکھ

مقامِ وصل تو ارض و سما کے بیچ میں ہے ۔۔۔۔۔ میں اس زمین سے نکلوں، تُو آسماں سے نکل

مختصر یہ کہ ہندوستان میں جدید اُردو غزل کا سفر جاری ہے۔ اکیسویں صدی کے اس ہنگامہ پرور دور میں بھی اُردو زبان و ادب کی جملہ اصناف میں تخلیق کاروں کی مشقِ سخن جاری ہے۔ وقت گزرتا ہے اور اپنے پیچھے بہت کچھ چھوڑ جاتا ہے۔ شاعر چلا جاتا ہے۔ اپنے پیچھے اپنا سرمایہ خلق چھوڑ جاتا ہے۔ زبانیں زندہ رہتی ہیں۔ ادب زندہ رہتا ہے۔ جب تک انسان سوچتا رہے گا، اس کا رشتہ قلم سے رہے گا۔ قلم تخلیق کرتا رہے گا، شاعری ہوتی رہے گی اور پڑھی جاتی رہے گی۔ اُردو غزل اُردو زبان کا تعارف اور چہرہ ہے، یہ چہرہ ہمیشہ تابندہ رہے گا۔

حوالا جات

۱۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، ''اردو غزل کا عبوری دور''، آفسیٹ پریس، دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۱۴۰

۲۔ پروفیسر آلِ احمد سُرور، ''نئے پرانے چراغ''، ادارہ فروغ اُردو، لکھنؤ، ۱۹۵۵ء، ص ۱۹۵

۳۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ''ادب اور تنقید''، سنگم پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد، ۱۹۶۸ء، ص ۶۴

۴۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند''، جلد پنجم، پنجاب یونی ورسٹی پریس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۲۰۸

۵۔ پروفیسر محمد حسن، ''جدید اُردو ادب''، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۷۵ء، ص ۱۰۱

۶۔ ڈاکٹر مظفر حنفی، ''جہات و جستجو''، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۴۸

۷۔ ڈاکٹر عقیل احمد رضوی، ''تاریخِ جدید اُردو غزل''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۲۴۹

۸۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، بحوالہ محمد شمس الحق، ''پیمانۂ غزل''، جلد دوم، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۲۲۰

۹۔ احتشام حسین، ''اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ''، القمر انٹر پرائز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۶۹

۱۰۔ حقانی القاسمی، ''بقدرِ ظرف ہے تنگنائے غزل'' مشمولہ سہ ماہی ''دربھنگہ ٹائم''، لال باغ، دربھنگہ، ۲۰۱۷ء، ص ۶۱

۱۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''اثبات و نفی''، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۷۱

۱۲۔ کوثر مظہری، ''۸۰ء کے بعد کی غزلیں (انتخاب)''، امکان انٹرنیشنل، دہلی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۶۸

رفتارِ ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

دلِ بے تاب

صفحات : ۸۰۰، قیمت: ۱۶۰ روپے
ناشر : کوہی گوٹھ پبلی کیشنز، کراچی

مبصر— گوہر تاج

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ شیر شاہ کون؟ تو میں کہوں گی کہ سماج میں بکھرے رنج والم کو سمیٹنے کا دوسرا نام شیر شاہ سیّد ہے۔

سال ہا سال سے ڈاکٹر شیر شاہ نام ونمود کی طمع سے دور، انسانیت کا بھاشن دیے بغیر مصروف پیکار ہیں، کبھی غریب عورتوں کے فیسٹولا کے لیے مفت سرجری کیمپ لگاتے ہیں تو کبھی سماج میں بکھری، دلوں کو چیرتی کہانیوں کو قلم بند کرتے ہیں تو کبھی ہفتہ وار ریڈیو پروگرام ''علم وآگہی کا سفر'' کے ذریعہ علم کی روشنی بکھیرتے۔ بقول ہمارے ایک مشترکہ دوست ڈاکٹر حسن جاوید کے ''ہم باتیں بناتے ہیں، سیّد کام کرتا ہے۔''

ان کے تازہ مجموعے ''دلِ بے تاب'' میں زندگی سے مستعار کہانیاں ہی نہیں، خلوصِ دل سے لکھے تین دلچسپ شخصی خاکے بھی ہیں جو انھوں نے اپنے چچا جان، سید ابوالبر رضوی، بڑے بھائی ظفر سلطان سیّد اور گہرے دوست سیّد جاوید حیدر پہ لکھے ہیں۔ ان سب شخصیات میں جو قدر مشترک ہے، وہ ہے سچائی، علمیت اور انسان دوستی۔ یقیناً انسان اپنے حلقۂ احباب سے ہی پہچانا جاتا ہے۔

تین خاکوں کے علاوہ کتاب میں سماج کی تلخ حقیقتوں پہ مبنی آٹھ دل گرفتہ کہانیاں بھی ہیں۔

پہلا بہت دلچسپ خاکہ ''تم جیو ہزاروں سال'' انھوں نے اپنے امریکا میں سال ہا سال سے مقیم، طبیعیات میں پی ایچ ڈی چچا سیّد ابوالبر رضوی پہ لکھا ہے، جو اپنی غیر روایتی سوچ کے ساتھ، زندگی کو سائنسی اصولوں اور فطرت کے قوانین کے تحت گزارتے ہیں۔ وہ مرنے کے بعد اپنے سارے اعضا کو عطیہ کرنے اور تحقیق کے لیے استعمال کرنے کے قائل ہیں۔ شیر شاہ سے اپنی وصیت اس طرح بیان کرتے ہیں۔ ''میں مرنے کے بعد دفن نہیں ہونا چاہتا اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ کوئی مولوی صاحب میری زندگی کے بعد میرے جسم کے انچارج بن جائیں اور وہ بتائیں کہ میرے جسم کے ساتھ کیا کیا جائے۔'' وہ ویگن (سبزی خور) ہیں اور جانوروں کو صنعت بنانے کے

خلاف خاموش پر امن جنگ جو ہیں جن کی جنگ ان لوگوں کے خلاف ہے جو جانوروں پر ظلم کرتے ہیں۔

دوسرا خاکہ ''آدمی اندر جہاں ہفت رنگ'' اپنے بڑے بھائی ظفر سلطان سید مرحوم پہ لکھا گیا ہے جنھیں شیر شاہ کے والد نے اپنی شادی سے قبل پٹنہ میں پوری ذمہ داری سے اپنایا۔ اس ننھے سے بچے کے والدین مر چکے تھے اور اسے سہارے کی ضرورت تھی۔ شیر شاہ کے والد نے انھیں اپنے نام کے ساتھ پیار اور تعلیم کے ساتھ کتب بینی کا انمٹ شوق دیا۔ ظفر سلطان سید سچائی، سخت محنت، سماجی انصاف پسندی، ادب نوازی، سلجھے ہوئے اندازِ گفتگو اور حس مزاح کی وجہ سے انشورنس کے شعبے میں کامیاب ترین انسان سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنی کارکردگی کی بنیاد پہ ڈھیروں ایوارڈز کے علاوہ امریکن لائف انشورنس کمپنی کا ملین ڈالر راؤنڈ ٹیبل ایوارڈ بھی جیتا۔ افسوس سگریٹ نوشی اور کینسر نے انھیں باون سال تک ہی جینے کی مہلت دی۔ انتقال سے چند سال قبل جنگ کے صفحۂ اوّل پہ ان کی تصویر کے ساتھ لکھا تھا، ''زبردست خدمت، سعیِ عمل اور سراپا کامیابی کا مطلب زیڈ ایس سیّد ہے۔'' ان کے مرنے کے بعد شیر شاہ نے پہلی بار اپنے والد کو پھوٹ پھوٹ کے روتے دیکھا۔

تیسرا خاکہ ''جو تیری طرح جیتے ہیں وہ مرتے کب ہیں'' ہمارے مشترکہ دوست جاوید حیدر پہ لکھا گیا جو آرکی ٹیکٹ کے شعبے میں پی ایچ ڈی تھے۔ امریکا کی پن یونی ورسٹی کے مثالی پروفیسر۔ لیکن ان کی ایک اہم پہچان ضیا آمریت کے دور میں عملی ترقی پسندی، بائیں بازو کے نظریات سے مکمل آگاہی اور سماجی تبدیلی کے لیے ان تھک جدوجہد تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب جاوید حیدر اور ان کے اور بھی کئی ترقی پسند ساتھی ترکی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے پاکستان لوٹے تھے۔ عملی، ادبی اور سیاسی جدوجہد کے لیے انھوں نے ایک گروپ ''فورم'' کی تشکیل کی۔ اپنی عملی جدوجہد کے سبب جاوید اور ان جیسے سارے ترقی پسند مسلسل حکومت کے عتاب میں رہے۔ فوجی مملکت خداداد میں جب جان کو خدشہ لاحق ہوا تو بالآخر جاوید امریکا چلے گئے۔ پنسلوینیا میں پن اسٹیٹ یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی سے ڈگری کے بعد انھوں نے وہاں تیس سال بطور استاد پڑھایا۔ ان کی دلچسپی بچوں اور بوڑھوں اور ان کے لیے دوستانہ عمارتوں اور قدرتی ماحول کی فراہمی سے تھی۔ جاوید نے دو دفعہ پاکستان آکر بسنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ لیکن آخر کار زندگی کے آخری سالوں میں جاوید اور ان کی بیوی کراچی کے ایک مشہور تعلیمی ادارے سے وابستہ ہوئے۔ لیکن اب زندگی کی گھڑیاں تھوڑی رہ گئی تھیں۔ سگریٹ نوشی اور پھیپھڑے کا سرطان ان کے جان کے درپے تھا۔ ایک دن علم، انسانیت اور موسیقی سے شوق رکھنے والے جاوید کی زندگی کا ساز ٹوٹ گیا۔ مگر انسانوں سے جڑے لوگ مرتے کہاں ہیں، وہ تو ہمارے دلوں میں زندہ رہتے ہیں— ہمیشہ کے لیے۔

کتاب میں خاکوں کے علاوہ آٹھ دل کو چھوتی سچی کہانیاں ہیں۔ شیر شاہ کو پڑھنے والے جانتے ہیں کہ وہ تھوڑے سے وقت میں بہت سارے کام انجام دینے کے عادی ہیں۔ اپنی کہانیوں کو ادبی قبا اُڑھانے اور سجانے کا ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ ویسے لوگ ان کی تحریروں کی سادگی، سچائی اور دل سوزی کی وجہ سے ان کے خاصے مداح ہیں۔ ان کی کہانی طویل بھی ہو تو دلچسپی برقرار رہتی ہے۔

تاہم ساری کہانیوں پہ لکھنا ممکن نہیں لیکن چند متاثر کن کہانیوں پہ بات ہو سکتی ہے۔

''ایک انگوٹھی'' کا بنیادی تھیم جنگوں کے ہاتھوں تباہی اور انسانی جانوں کی پامالی ہے۔ یہ وہ انگوٹھی ہے جو موت کے وقت راشد منہاس کے مقابل فوجی پائلٹ مطیع الرحمان کی انگلی میں تھی۔ اور اب راولپنڈی کے فوجی میوزیم میں ہے۔ اس کی جوان بیوہ اس یادگار کو

واپس لینا چاہتی تھیں۔ لیکن ان کی درخواست رد ہوئی۔ اور ایسا ممکن نہ ہوا۔ شیر شاہ لکھتے ہیں، ان سیاسی طاقتوں کو ''اس پیار کی گرمائش کا اندازہ ہو ہی نہیں سکتا جو ہمیشہ دل کی دھڑکنوں میں شامل رہتی ہے...''

عالمی ادیب اطفال اردو ڈائریکٹری

صفحات : ۱۱۲، قیمت: ۸۰۰ روپے

ناشر : سرائے اردو پبلی کیشنز، سیال کوٹ۔ فون: ۰۳۳۳۔۸۶۳۱۴۲۸

مبصر — فاکہہ قمر

میں اللہ تعالیٰ کا بے پناہ شکر ادا کرتی ہوں کہ میرے ایک دیرینہ خواب کی تکمیل اچانک سے پوری ہو چکی ہے جس کے لیے میں نے بے شمار ادیبوں کا غیر مناسب رویہ بھی برداشت کیا اور ان کی باتیں بھی سنی ہیں۔

جون ۲۰۲۱ء میں اس منصوبے کا آغاز ہوا تو بچوں اور بڑوں کے نامور ادیب و کالم نگار محترم جناب ذوالفقار علی بخاری نے مل کر ''عالمی ادیب اطفال اردو ڈائریکٹری'' شائع کرنے کا پیغام دیا۔ اُن دنوں ایک صاحب اپنی مصروفیات کی وجہ سے منصوبے سے دور ہو چکے تھے اور میں نے تن دہی سے کچھ ایسے جوشیلے انداز میں کام شروع کیا کہ محض سات ماہ میں کوائف کا حصول ممکن بنالیا لیکن پھر اشاعت کے بھاری اخراجات کی وجہ سے یہ منصوبہ تعطل کا شکار ہوا لیکن اب الحمدللہ ''عالمی ادیب اطفال اردو ڈائریکٹری'' شائع ہو چکی ہے۔

''عالمی ادیب اطفال اردو ڈائریکٹری'' کے پہلے حصے میں ۱۲۵ سے زائد کہانی نویسوں اور شعرا کے کوائف محفوظ ہوئے ہیں۔ بچوں کے نامور ادیب، مدرس اور مدیرِ اعلیٰ سہ ماہی ''سرائے اردو'' اور سہ ماہی ''باغیچۂ اطفال'' ذوالفقار علی بخاری کے بقول:

> یہ اپنی نوعیت کی منفرد ڈائریکٹری ہے کہ دنیائے ادب اطفال اردو کے نمایاں اور نئے ادیب ایک ساتھ ڈائریکٹری میں شامل ہیں اور یقین کامل ہے کہ باہمی رابطے سے ادبِ اطفال کے فروغ کا سبب اور باہمی تجربات سے مستفید ہونے کا موقع مل سکے گا۔

اس ڈائریکٹری کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ صاحب کتاب ادیبوں کی کتب کے حوالے سے معلومات فوری طور پر حاصل ہو جائیں گی اور ان سے براہِ راست رابطہ کرنا ممکن ہو سکے گا۔ پاکستان میں اس منفرد ڈائریکٹری کو ۸۰۰ روپے بشمول ڈاک خرچ میں گھر بیٹھے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

بارے کچھ اپنا بیاں ہوجائے

سیّد عابد رضوی (مدیرِ منتظم)

اس بات کا ادراک کیا گیا ہے کہ اس صفحے پر ہمارے تمام معزز قارئین و ناقدین کی مثبت یا تنقیدی آرا جو کہ ہمارے شمارے کو بہتر سے بہتر بنانے میں مدد ومعاون ہوں، یہاں بلاکم وکاست شائع کی جائیں۔ فی الحال ابتداً چند اہلِ علم ودانش کی آرا پیش کی جارہی ہیں۔ (مدیرِ منتظم)

محترم قارئین! جون کا مہینا حجاجِ کرام کو خصوصیت کے ساتھ اللہ کے انوار و برکات سے مالا مال اور مسلمانانِ عالم کو عمومی طور پر، ان کے اپنے اپنے دیسوں، شہروں اور قریوں میں، سنتِ ابراہیمی کی پیروی، بڑے جوش وخروش اور جذباتِ ایمانی کے ساتھ انجام دینے پر ۱۰؍ ذی الحجہ کو، عید الاضحیٰ کی خوشیوں کا لازوال تحفہ دے کر رخصت ہوا اور اب نئے ہجری سال کا، آغاز ہوا چاہتا ہے جس میں حرمت والے مہینے یعنی محرم الحرام کی ۱۰ تاریخ کو کائنات کی اُس عظیم قربانی کو یاد کیا جائے گا جس کے تذکرے کے بغیر تاریخ انسانی ادھوری رہے گی۔ جس کا قرآن نے فدیناہ بذبح عظیم کہہ کر تعارف کرایا ہے۔ یقیناً ایک دنبہ ذبحِ عظیم کا مصداق نہیں ہوسکتا، وہ تو ایک جلیل القدر پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فدیہ تھا۔

صاحبو! ''قومی زبان'' کا تازہ شمارہ جب آپ کے ذوقِ مطالعہ کی سیرابی کو آپ کی دسترس میں آئے گا، اُس وقت تک عیسوی کیلنڈر کے مطابق سال کا ساتواں مہینا یعنی جولائی اپنی آب وتاب کے ساتھ ہم سے اٹکھیلیاں کرنے پر آمادہ ہوگا۔

رومیوں کے زمانے میں، اُن کے مستعمل کیلنڈر کے مطابق یہ سال کا پانچواں مہینا متصور ہوتا تھا اور وہ اس کو Quintillis کا نام دیتے تھے۔ پھر جولیس سیزر کے اعزاز میں جس نے اس مہینے کی ۱۲ تاریخ کو اس عالمِ آب و گل میں آنکھ کھولی، اس کو جولائی کے نام سے معنون کردیا گیا۔ سرد موسموں والے خطوں میں یہ درمیانی گرمیوں کا موسم ہوتا ہے۔ مہاجر پرندے، غول کے غول، جھنڈ کے جھنڈ، اپنے علاقوں کی طرف رواں دواں، پرواز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جون کی گرمیوں میں باغوں میں کھلے پھول اب مرجھانے لگتے ہیں۔ مخملیں گھاس کی دل کشی ورعنائی ماند پڑنے لگتی ہے۔ پت جھڑ کا آغاز ہوجاتا ہے۔ وطنِ عزیز میں یہ مون سون کا موسم ہوتا ہے مگر انسانی بداحتیاطیوں اور آبی وسائل کی خطرناک حد تک کمی کے باعث یہ موسم ہمارے پاس بڑی قہرسامانیوں کے ساتھ آیا ہے۔ ہر چند کہ یہ کھلے آسمان اور چمکتی خوش گوار دھوپ کا موسم ہے مگر آندھیوں اور تیز ہواؤں کے باعث موسم ابر آلود دکھائی دیتا ہے۔ اوپر سے جھلسا دینے والی لُو جیسی گرم ہوائیں، پھر ستم بالائے ستم، وقت ناوقت کی بجلی کی ترسیل میں گھنٹوں کی کٹوتی، اربابِ اختیار کی بے حسی، احتجاج، چیخ و پکار، لوگوں کی اموات پر کسی کے کانوں جوں نہیں رینگتی۔ اس پر طرہ سیاست کی گرم بازاری، غریب غربت کی لکیر سے اور نیچے بلکہ پاتال میں پہنچ رہے ہیں، نہ تو اُن کے پاس اتنے پیسے ہیں کہ وہ باہر چلے جائیں، نہ ہی وہ اندر رہ کر گزارہ کرسکتے ہیں۔ اب تو

قبریں بھی عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہوگئی ہیں، الٰہی ترے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں۔ کوئی مسیحا، کوئی نجات دہندہ۔ کوئی حالات کا سدھارنے والا — هَلْ مِنْ نَاصِرٍ يَنْصُرُنَا۔

مجھ، ہرچند کہ کوتاہ قلم کی عادت ہے کہ رات کے پچھلے پہر، جب خلقِ خدا اپنے آرام دہ بستروں پر محوِ خواب ہوتی ہے، ایک ہی نشست میں قلم برداشتہ جو دماغ میں سماتا ہے اور دل چاہتا ہے، ٹائپ کرکے اپنے کمپوزر صاحب کو پوسٹ کردیتا ہوں اور دوسرے دن دفتر جاکر کچھ کتر بیونت کرکے مضمون اشاعت کے لیے دے دیتا ہوں اور محبت کرنے والے احباب، اس کو پسند فرماتے، میرا حوصلہ بڑھا دیتے ہیں۔ مگر ان دنوں کچھ گرمی کی شدت، کچھ ماحول کی بے کیفی، کچھ طبیعت کی سازی، کچھ عجب سی اداسی کہ خیالات کدھر سے کدھر بھٹک رہے ہیں، لکھنا دشوار ہوگیا ہے۔ گزشتہ شمارے کی بابت ڈاکٹر شبیر احمد قادری نے بکمالِ محبت مدیر ''قومی زبان'' ڈاکٹر یاسمین فاروقی کے اداریے کی بہت تعریف کی اور فیس بک پر مجھ کج مج بیاں کی تحریر کو سراہا۔ ''قومی زبان'' کی مجلسِ ادارت اُن کی سپاس گزار ہے۔

ہمارے محترم پروفیسر سحر انصاری بھی فون کرکے ''قومی زبان'' کے شماروں کے معیار کی بابت بڑی دل خوش کن گفتگو کرتے ہیں۔ وہ سخن شناس ہیں، اچھی چیز کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتے، یہ اُن کی بڑائی ہے۔

صاحبو! ہمیں بہت خوشی ہے کہ جبران خلیل جبران کی مشہور زمانہ کتاب The Prophet جس کا ترجمہ برصغیر کے جانے مانے صحافی، ادیب، شاعر، سوانح نگار، مترجم قاضی عبدالغفار نے ''اُس نے کہا'' کے عنوان سے کیا تھا، اس پر مصر کے عرب نژاد مگر اردو کے مایہ ناز محقق ڈاکٹر احمد محمد احمد عبدالرحمٰن القاضی نے اپنا ایم فل کا مقالہ بڑی جاں فشانی سے تحریر کیا تھا اور اُن کو دہلی یونی ورسٹی سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی تھی۔ وہ مقالہ انجمن نے کتاب کی شکل میں راقم الحروف کے پیش لفظ کے ساتھ شائع کردیا ہے جو ہمارے شعبۂ فروخت سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

گزشتہ ماہ انجمن نے غیرمنقسم ہندوستان میں انجمن ترقی اردو ہند کے پہلے سیکریٹری علامہ شبلی نعمانی اور انجمن کے نام سے دارالندوہ، اعظم گڑھ کے شبلیات کے ماہر ڈاکٹر الیاس الاعظمی کی کتاب شائع کی تھی۔ گزشتہ دنوں ندوہ کی سو برس سے زیادہ کی تاریخ میں ڈاکٹر اعظمی پہلی شخصیت ہیں جن کو پہلے شبلی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کے جملہ اراکین ڈاکٹر صاحب کے اس اعزاز پر اُن کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

ہمارے اوسی آر پروجیکٹ پر ہمارا دامے درمے قدمے سخنے عملے تعاون این ای ڈی یونی ورسٹی کے شعبۂ کمپیوٹر کے ساتھ جاری ہے۔ حال ہی میں ہم نے این ای ڈی کی فرمائش اور اُن کی تجاویز پر اُن کو مزید تیز رفتار کمپیوٹر مہیا کردیا ہے۔ ہمارے کمپوزر صاحبان بھی بہت تن دہی سے اُن کو ہر قسم کا اردو ڈیٹا دے رہے ہیں۔ اس پروجیکٹ پر خطیر رقم صرف ہوچکی ہے اور اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ اب وہ دن دور نہیں کہ جب اس ایپ ''قومی زبان اردو'' سے عام لوگ بھی استفادہ کرسکیں گے۔

انجمن کی تازہ مطبوعات

فون (شعبۂ فروخت): ۰۳۳۲-۲۷۹۰۸۴۳

کتاب	مصنف	قیمت
۱۔ علامہ شبلی اور انجمن ترقیٔ اردو	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۸۰۰ روپے
۲۔ اردو ادب میں روحانیت و مادّیت کی کش مکش	ڈاکٹر تہمینہ عباس	۱۴۰۰ روپے
۳۔ منقبتی و رثائی ادب اور اردو شاعرات	تسنیم عابدی	۲۷۰۰ روپے
۴۔ ایسکیمو (ناول)	پیٹر فروئے کین، ترجمہ: مسعود اختر	۱۲۵۰ روپے
۵۔ اعمال نامہ	سر رضا علی	۱۵۰۰ روپے
۶۔ نواب محبت خاں محبت: احوال و آثار	ڈاکٹر فدا حسین انصاری	۱۳۰۰ روپے
۷۔ قواعدِ اردو	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	۷۵۰ روپے
۸۔ بوطیقا (اشاعت ہشتم)	ارسطو، ترجمہ: عزیز احمد	۳۰۰ روپے
۹۔ جدید اردو شاعری (اشاعت سوم)	عزیز حامد مدنی	۷۰۰ روپے
۱۰۔ اردو تنقید کا ارتقا (اشاعت نہم)	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۸۰۰ روپے
۱۱۔ چند ہم عصر	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	۶۰۰ روپے
۱۲۔ تنقید اور جدید اردو تنقید (اشاعت پنجم)	ڈاکٹر وزیر آغا	۶۰۰ روپے
۱۳۔ اشاریہ 'قومی زبان'	تحقیق و ترتیب: میر حسین علی امام	۷۰۰ روپے
۱۴۔ مکتوباتِ مولوی عبدالحق بنام مشاہیر مع تنقیدی مضامین	میر حسین علی امام/ ڈاکٹر یاسمین سلطانہ فاروقی	۲۴۰۰ روپے
۱۵۔ تہذیبی تنوع اور اردو ناول	ڈاکٹر مہر ونہ لغاری	۱۲۰۰ روپے
۱۶۔ اردو ادب کی تحریکیں (اشاعت دوازدہم)	ڈاکٹر انور سدید	۱۴۰۰ روپے
۱۷۔ اردو ادب میں دہشت گردی کی ارتقائی عکاسی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر ثروت اختر (قرۃ العین طارق)	۲۰۰۰ روپے
۱۸۔ تابغۂ لسان و ادب: محمد شان الحق حقی دہلوی	ڈاکٹر عرفان شاہ	۱۲۰۰ روپے
۱۹۔ جدید اور مابعد جدید تنقید	ڈاکٹر ناصر عباس نیر	۱۲۰۰ روپے
۲۰۔ اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر	ڈاکٹر رؤف پاریکھ	۱۴۰۰ روپے
۲۱۔ اردو کی ادبی تاریخیں	ڈاکٹر گیان چند	۱۵۰۰ روپے
۲۲۔ اردو اور عالمی صحافت کی ایک نادر تاریخ	ڈاکٹر طاہر مسعود	۲۲۰۰ روپے
۲۳۔ منگل سُوتر (ناول)	پریم چند/ ہندی سے ترجمہ: ڈاکٹر حسن منظر	۶۰۰ روپے
۲۴۔ پریم چند گھر میں	شِو رانی/ ہندی سے ترجمہ: ڈاکٹر حسن منظر	۲۰۰۰ روپے
۲۵۔ اردو میں ارمغانِ علمی کی روایت	ڈاکٹر خالد ندیم	۱۰۰۰ روپے
۲۶۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر): تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بی بی امینہ	۱۰۰۰ روپے
۲۷۔ روسی ادب (دو جلدیں یک جا)	پروفیسر محمد مجیب	۱۴۰۰ روپے
۲۸۔ تلمیحاتِ راشد	ڈاکٹر عابد خورشید	۸۰۰ روپے

مطبوعات انجمن ترقی اُردو پاکستان

طبع شدہ قیمت:۲۷۰۰ روپے

طبع شدہ قیمت:۱۴۰۰ روپے
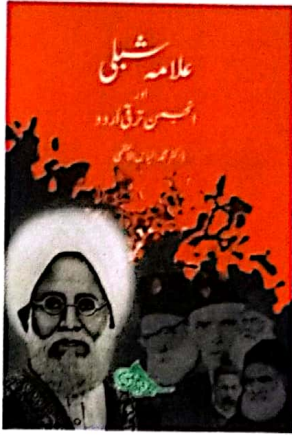
طبع شدہ قیمت:۸۰۰ روپے

طبع شدہ قیمت:۱۲۰۰ روپے

طبع شدہ قیمت:۱۵۰۰ روپے
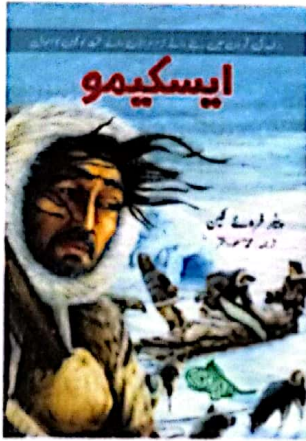
طبع شدہ قیمت:۱۲۵۰ روپے

طبع شدہ قیمت:۷۰۰ روپے

طبع شدہ قیمت:۱۳۰۰ روپے

طبع شدہ قیمت:۲۰۰۰ روپے

مطبوعات انجمن ترقی اُردو پاکستان
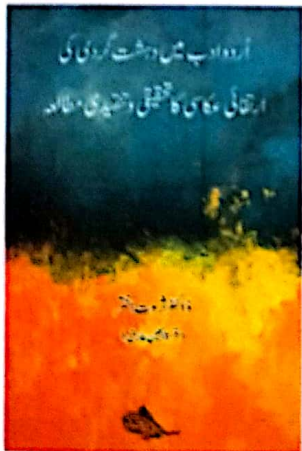
طبع شدہ قیمت:۲۰۰۰روپے

طبع شدہ قیمت:۶۰۰روپے

طبع شدہ قیمت:۱۴۰۰روپے

طبع شدہ قیمت:۱۴۰۰روپے

طبع شدہ قیمت:۱۵۰۰روپے

طبع شدہ قیمت:۱۰۰۰روپے

طبع شدہ قیمت:۱۰۰۰روپے
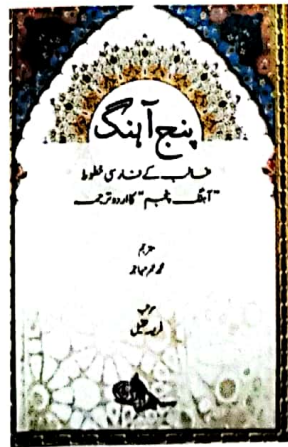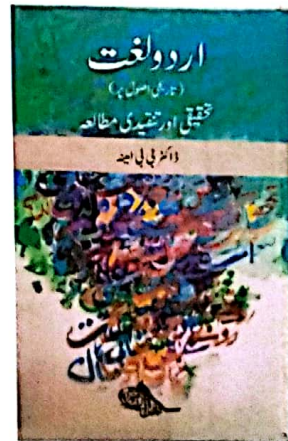
طبع شدہ قیمت:۶۰۰روپے

طبع شدہ قیمت:۸۰۰روپے

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.